

# پیر خادشا تہ مجاہد

تباہی و تباہی



# یہ حادثاتِ محبت

سباس گُل

## قسط نمبر 1

”شام کے چار بجے ہیں اور لگ رہا ہے جیسے رات ہو گئی ہے۔“ فرجاد نے کاٹیج کی کھڑکی سے باہر آسمان پر پھیلے سیاہ بادلوں اور وادی کے محافظوں کی سی آن بان سے کھڑے برف پوش پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج رات خوب برف باری ہوگی ابھی تو ہلکی ہلکی برف کی پھوار پڑ رہی ہے۔ صبح تک سارا راستہ برف سے ڈھک جائے گا صاب، اور آپ ادھر ای بند ہو جائے گا۔“ کاٹیج کے چوکیدار اور ملازم شیر خان نے کہا۔

”تمہارے منہ میں برف کے گولے پڑیں۔ اللہ نہ کرے جو میں یہاں بند ہو جاؤں۔ دو چار دن کی تو خیر ہے۔ اس کے بعد تو مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔“ فرجاد نے اس کی جانب دیکھ کر دوبارہ باہر برف باری کے منظر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”صاب! بندہ ادھر آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا موسم کی مرضی سے ہے۔“ شیر خان نے ہنس کر کہا۔

”اور جو کوئی اپنی مرضی سے جانا چاہے تو۔“ فرجاد نے اس کی طرف دیکھا۔

”تو صاحب، اس کا اللہ وارث ہے۔ ادھر ہر سال برف باری پر کئی حادثے ہو جاتے ہیں۔ کوئی ٹریفک میں پھنس کر مر جاتا ہے، کوئی پہاڑی سے گر کر مر جاتا ہے۔ پر لوگ ادھر چھٹیاں منانے اور وہ کیا بولتا ہے شادی کے بعد جو دولہا اور دلہن منانے جاتا ہے۔“

”یعنی موت۔“ فرجاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں واقعی ووئی، وہ منانے کے لیے ادھر آتا ہے، پر صاب! آپ ہر دفعہ اکیلا ہی آتا ہے۔ آپ بھی عجیب ہے صاب۔ لوگ ادھر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ یا دوستوں کے ساتھ آتے ہیں اور آپ اکیلے آتے ہیں۔ اکیلے کیا مزا آتا ہے صاب۔ مزا تو اکٹھے ہونے میں آتا ہے۔ کوئی تو اپنا سنگی ساتھی ساتھ ہونا چاہیے ناصاب۔“ شیر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کہتے تو تم ٹھیک ہو شیر خان، مگر اکیلے سیر کرنے کا بھی اپنا ایک مزا ہے۔“

”کیا خاک مزا ہے صاب! آدمی گم صم سامنا نظر کو تکتا رہتا ہے اور چپ چاپ واپس چلا جاتا ہے۔ ایسے پر فضا مقام پر تو کوئی پیارا یا پیاری ساتھ ہونی چاہیے ناصاب۔ آپ شادی کر لیں بڑا مزا آئے گا۔“ شیر خان نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔

”کسے؟“ فرجاد نے اس کی بات سن کر ہنستے ہوئے پوچھا۔

”او آپ کو صاب اور کسے۔“ وہ شرما کر ہنستے ہوئے بولا۔

”تمہاری شادی تو ہو گئی ہے نا؟“ فرجاد نے کھڑکی کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں صاب! اب تو ہم کو ”باباجان“ کہنے والا بھی اس دنیا میں آنے والا ہے۔“ اس نے شرماتے ہوئے بتایا۔

”اور اگر ”والی“ آگئی تو۔“ فرجاد نے اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو ہم آپ کی بھی جی جان سے رکھوالی کرے گا۔ اولاد تو اولاد ہوتی ہے صاب۔ بیٹا ہو کہ بیٹی، ہوتی تو ماں باپ کے

وجود کا حصہ ہے نا اور اپنے وجود سے اپنے آپ سے تو ہر کوئی پیار کرتا ہے۔“ شیرخان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”صحیح کہا ہے تم نے۔ کاش! سارے مرد تمہاری طرح سوچنے لگیں اور بیٹی کو عزت اور محبت سے پروان چڑھائیں، اسے

بیٹے سے کم تر نہ سمجھیں۔ کاش! ایسا ہو سکے۔“ فرجاد نے برف باری دیکھتے ہوئے حسرت بھرے لہجے میں کہا تو اسی لمحے انہیں اور

شیرخان کو ایک دل دوز اور روح فرسا چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی لگا جیسے کچھ نیچے آ گیا ہے۔ ان کا کاٹھ نیچے وادی میں تھا اور اوپر بھی

کافی آبادی تھی۔

”الہی خیر۔ یہ تو کسی بچی کی آواز تھی۔“ فرجاد نے خوف سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر کرسی سے اٹھ کر پریشان لہجے میں کہا۔

”لگتا ہے صاب! پھر کوئی پہاڑی سے گرا ہے۔“ شیرخان نے اندازہ لگایا۔

”افوہ۔ تم اندازے لگاتے رہنا۔ چلو باہر نکل کر دیکھیں شاید کسی کو ہماری مدد کی ضرورت ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔“ فرجاد

نے جھلا کر کہا اور تیزی سے کاٹھ سے باہر نکل آئے۔ سر پر چترالی ٹوپی رکھ لی تاکہ برف باری سے بچ سکیں۔ شیرخان بھی ان کے

ساتھ چلتا ہوا آواز کی سمت آیا تو برف کے ایک تودے پر انہیں ایک انسانی وجود بے حس و حرکت پڑا دکھائی دیا۔

فرجاد تیزی سے بھاگتے ہوئے اس کے قریب پہنچے۔ اس کے شانے کو پکڑ کر ہلایا۔

”ہیلو کون ہیں آپ۔ آنکھیں کھولیں۔“ فرجاد نے اسے پکارتے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف کیا تو ان کے دل پر خنجر چل

گئے۔ خون میں لت پت یہ چہرہ ایک اٹھارہ بیس برس کی لڑکی کا تھا۔ اس کے بکھرے بال پیشانی میں لہو سے جم گئے تھے۔

”اوہ.....نو۔ یہ تو لڑکی ہے۔“ فرجاد کے لبوں سے بے اختیار یہ الفاظ پھیلے۔

”مبارک ہو صاب۔ لوگ تو طنز سے محاورہ بولتے ہیں کہ تمہارے لیے کیا جنت سے کوئی حور آئے گی۔ آپ کے لیے تو

اللہ سائیں نے سچ مچ جنت سے حور بھیج دی ہے۔ اوپر سے سیدھا آپ کے پاس آ کے گرا ہے۔“ شیرخان نے بیٹھ کر اسے دیکھتے

ہوئے کہا۔

”فضول بکو اس کیے جاؤ گے۔ دیکھ نہیں رہے اس کی حالت کیا ہو رہی ہے۔ اس کی نبض چل رہی ہے۔ چلو تم اس کا بیگ

اور یہ مودی کیمرہ اٹھاؤ میں لڑکی کو اٹھاتا ہوں۔“ فرجاد نے لڑکی کے قریب پڑے بیگ اور کچھ فاصلے پر پڑے ہینڈی کیمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا تو وہ چیزیں اٹھاتے ہوئے شرارت سے بولا۔

”صاب! آپ شریف آدمی ہیں لڑکی کو اٹھائیں گے۔“

”بے وقوف آدمی، یہ کون سا موقع ہے مذاق کرنے کا۔ اس کا سامان اٹھاؤ اور جلدی چلو۔ میرا میڈیکل باکس نکالو اور پانی گرم کر کے لاؤ۔ اگر اس کا خون زیادہ بہہ گیا تو کیا فائدہ ہوگا ہمارے یہاں جلدی پہنچنے کا۔“ فرجاد اس نرم و نازک حسینہ کو اپنی بانہوں میں اٹھا کر تیزی سے کاٹیج کی جانب بڑھاتے ہوئے بول رہے تھے۔ شیرخان ان سے زیادہ تیز دوڑا اور کاٹیج کا دروازہ کھول دیا۔ فرجاد نے لڑکی کو اپنے گرم کمرے میں بستر پر لٹا دیا۔

”صاب! آپ کا ڈاکٹری صندوق۔“ شیرخان ان کا میڈیکل بکس لے آیا جو وہ ہر طویل سفر میں خاص کر پہاڑی علاقوں کے سفر میں اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آسکے۔ اور آج اس بکس کی ضرورت آن پڑی تھی۔

”صندوق کے بچے! جلدی سے پانی گرم کر کے لاؤ، اس کے زخم صاف کرنے ہیں۔“ انہوں نے بکس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

”ابھی لایا۔“

”پتا نہیں کس کے جگر کا ٹکڑا ہے یہ؟“ فرجاد روئی سے اس سر سے بہہ بہہ کر آنے والے خون کو صاف کرتے ہوئے تفکر سے گویا ہوئے۔

”لیس صاب! گرم پانی۔“ شیرخان برتن میں پانی لے آیا۔

”میز پر رکھ دو اور لڑکی کے جوتے اتار دو۔“ انہوں نے مصروف انداز میں کہا۔

”وہ کیوں جی؟“ اس نے ہولنقوں کی طرح پوچھا۔

”تاکہ تمہارے سر پر دے ماروں۔ کیوں کے بچے، اب یہ بے ہوشی کی حالت میں خود اٹھ کر جوتے اتارے گی کیا؟“ انہوں نے اسے نرمی سے ڈانٹ دیا۔

”نہیں جی۔“ وہ جھل سا ہو کر دانت نکالنے لگا اور لڑکی کے جوگرز اتار دیئے۔ فرجاد نے جلدی جلدی اس کا زخم صاف کیا، مرہم لگایا اور پٹی باندھ دی۔ چوٹ سر میں لگی تھی۔ چہرے پر بھی کچھ خراشیں آئی تھیں۔ بائیں رخسار پر وہ سمت میں جوگری تھی۔

”ویسے صاب۔ اللہ سائیں نے کتنی جلدی میری بات سن لی۔ ادھر میں نے آپ کی شادی کی بات کی ادھر اللہ سائیں نے لڑکی بھیج دی۔ لڑکی بھی حور پری ہے صاب۔“

”شٹ اپ۔ تمہاری بک بک بند نہیں ہو سکتی۔ موقع بے موقع مذاق سوچتا ہے تمہیں۔ یہ لڑکی کا اور کوٹ رکھو ایک طرف۔“ فرجاد نے لڑکی کا اور کوٹ بہت احتیاط سے اتار کر شیر خان کو دیتے ہوئے قدرے غصے سے کہا۔

”صاب۔ چیک تو کریں یہ لڑکی اصلی ہے کہ کپڑوں کی بنی ہوئی ہے۔ اس نے تو گرم کپڑوں کی پوری دکان پہنی ہوئی ہے۔“ وہ اور کوٹ لے کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”یہ تو اچھی بات ہے ورنہ اتنی اونچائی سے گرنے کے بعد تو اس کی ہڈی پسلی ایک ہو گئی ہوتی۔ اب یہ ہوش میں آئے گی تو معلوم ہوگا کہ کہیں فرپکچر تو نہیں ہوا اور یہ کہ یہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے، کیسے گری ہے؟“ فرجاد نے لڑکی کے بازو میں انجکشن لگاتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا تو شیر خان نے کہا۔

”صاب! اس لڑکی کا کیمروہ دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ فلم بناتے ہوئے گرا ہے۔“

”ہاں ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو، خیر تم اس کا کیمروہ اس کے بیگ میں رکھ دو۔ اور بیگ الماری میں رکھ دو۔ میں بعد میں دیکھوں گا شاید اس کے بارے میں کوئی اہم معلومات حاصل ہو جائیں۔“ فرجاد نے ہومیو پیتھک دواؤں کی شیشیاں دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

”صاب! برف باری تیز ہو گئی ہے۔ شکر ہے کہ ہم لڑکی کو ادھر لے آیا ورنہ یہ تو ادھر برف میں دب کر جم کر مر جاتا۔“ شیر خان نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔

”اچھا کھڑکی بند کر کے پردہ کھینچ دو۔ کمرہ گرم رکھنا ہے تاکہ اسے بخار نہ ہو اور جلدی ہوش آجائے۔“ فرجاد نے میڈیکل بکس میں سے دوشیشیاں نکال کر بکس بند کر دیا۔ اور خود ہاتھ دھونے چلے گئے۔

”صاب! آپ کے لیے کافی لاؤں؟“ وہ ہاتھ دھو کر آئے تو شیر خان نے پوچھا۔

”کافی عقل کی بات کی ہے۔ جاؤ فوراً بنا کر لاؤ اور اس لڑکی کے لیے سوپ بنا لینا۔“ انہوں نے مسکرا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے صاب۔“ وہ کچن کی طرف چلا گیا اور فرجاد اٹھ کر اسٹیجو سکوپ سے لڑکی کی حرکتِ قلب چیک کرنے لگے۔

”شکر ہے ہارٹ بیٹ تو نارمل ہے اب۔“ فرجاد نے اسٹیجو سکوپ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا تو اچانک ان کی نظر لڑکی کے گلے میں پڑی سونے کی زنجیر پر پڑی۔ انہیں لگا جیسے لاکٹ پر کچھ کندہ ہے۔ انہوں نے جھک کر احتیاط سے لاکٹ اس کی جزی سے باہر نکالا تو اس پر انگریزی حروف میں ”سجل“ کندہ دیکھ کر ان کی نظریں خود بخود اس کے چہرے پر اٹھ گئیں۔ انہیں وہ اپنے نام کا ہی پرتو دکھائی دی۔

”سجل۔ نام کی طرح خوبصورت ہوتی مگر کہاں سے آئی ہو؟“  
 ”کیا دیکھ رہے ہیں صاب!“ شیرخان کی آواز پر وہ چونک کر سیدھے ہو گئے۔  
 ”اس لڑکی نے جولا کٹ پہن رکھا ہے اس پر اس کا نام کنہہ ہے۔“  
 ”کیا نام ہے صاب۔“ شیرخان نے انہیں کافی کانگ دیتے ہوئے پوچھا۔  
 ”سجل۔“

”سجل، بڑا پیارا نام ہے صاب۔“  
 ”ہاں بس دعا کرو کہ اسے ہوش آجائے۔“ فرجاد نے کافی کاسپ لے کر کہا۔  
 ”انشاء اللہ ہوش آجائے گا صاب۔ میں ذرا سوپ بنا لوں۔“ وہ یہ کہہ کر دوبارہ کچن میں چلا گیا۔ فرجاد نے ”سجل“ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے دل میں کہا۔  
 ”یہ تو بے ہوشی میں ہوش اڑا رہی ہے۔ ہوش میں آ کر نجانے کیا ستم ڈھائے گی۔“  
 ”اوں ہوں، فرجاد حسین، یہ حماقت ہے چند منٹوں میں ہی چپت ہو گئے۔“ ان کے دماغ نے انہیں شرم دلائی۔  
 ”پتا نہیں مگر کچھ ہو ضرور گئے ہیں فرجاد حسین۔ دل کی حالت ایک دم بدل سی گئی ہے۔“ وہ زیر لب بولے تو دماغ نے دلیل سے سمجھایا۔

”دل کی حالت اس لڑکی کی زخمی حالت دیکھ کر بدلی جو کہ فطری بات ہے اور بس۔“  
 ”دل کے دوسرے جذبے بھی فطری جذبے ہوئے ہیں۔ اگر وہ کسی لمحے انسان پر حاوی آجائیں تو انسان کیا کر سکتا ہے سوائے ہاتھ ملنے کے؟ دل تو پل میں پاگل ہو سکتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے سجل کے چہرے کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے بے بس سے بولے اور دھیرے دھیرے کافی کے سپ لینے لگے۔  
 ”سجل، سجل ڈیر کہاں ہو کرن؟“ شہریار ہاتھ میں انگش فلم کی سی ڈی لیے اسے آوازیں دیتا گھر میں داخل ہوا تو لاؤنچ میں میگزین کا مطالعہ کرتی مشعل نے طنز سے کہا۔

”سجل کے علاوہ بھی اس گھر میں اور لوگ رہتے ہیں مسٹر شہریار۔“  
 ”ہاں مگر شہریار کے دل میں گھر کرنے والی ہستی تو ”سجل“ ہی ہے جو میرے دل میں رہتی ہے۔ ہے کہاں سجل؟“ شہریار نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا۔  
 ”جہنم میں۔“ اس نے جل کر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اچھا، وہاں وہ کیا کر رہی ہے؟“

”جلنے کی مشق کر رہی ہے۔“ اس نے اسی جلع انداز میں ہی جواب دیا تو وہ تہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ مشعل کا چہرہ غصے سے حد

سے سرخ ہو گیا۔

”ناممکن کرن مشعل۔ سب جہنم میں جا ہی نہیں سکتی۔ وہ تو بہت نیک ہستی ہے۔ اس کے لیے تو جنت الفردوس میں بکنگ ہو

چکی ہے۔“

”ہاں تم نے ہی تو کرائی تھی بکنگ۔“ مشعل نے طنز سے کہا۔ وہ پھر ہنس پڑا۔

”ہاں اگر مجھے موقع دیا جائے تو میں سب کی رہائش جنت الفردوس میں ہی بنواؤں گا۔ ویسے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔

خدا اسے عمرِ خضر عطا کرے صحت و تندرستی کے ساتھ۔ یہ تو مرنے کے بعد کی باتیں ہیں۔ اس وقت تو مجھے سب کی تلاش ہے۔“ اس

نے صوفے پر بیٹھ کر کہا۔

”تمہیں کب سب کی تلاش نہیں ہوتی؟“

”جب وہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔ اپنی ہاؤ، اب تو وہ ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ سب، سب کہاں

ہو یا اب ابھی جاؤ۔“

”تمہیں چین نہیں آتا اس کے بغیر۔“ مشعل نے اس کے سب کو پکارنے پر کہا۔

”چین آتا“ تو میں دن میں دس سار ادھر کیوں آتا۔ چین تو اسے دیکھ کر ہی آتا ہے۔ اسے نہ دیکھوں تو لگتا ہی نہیں ہے

کہ صبح ہو گئی ہے۔“

شہر یار بہت ایمانداری اور صاف گوئی سے اپنے دلی جذبات کا اس کے سامنے اظہار کر رہا تھا۔ یہ سمجھے بغیر کہ اس کی

باتیں مشعل کے مزاج پر کس قدر گراں گزر رہی ہیں۔ اس کے اندر کس قدر حسد کی آگ میں اضافہ کر رہی ہیں۔

”ارے شیری بھائی آئے ہیں۔“ سب لاؤنج میں داخل ہوئی تو اسے دیکھ کر خوشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ وہ نہا کر آئی

تھی۔ شانوں پر گیلے بالوں کی ریشم بکھری ہوئی تھی۔ گلابی کاٹن کے سوٹ میں وہ بہت نکھری اور اجلی اجلی لگ رہی تھی۔ شہر یار چند

لحوں کو تو اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ مشعل اس کا سب کو یوں دیکھنا بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ سب کو اس کے سامنے

سے غائب کر دیتی یا پھر شہر یار کی آنکھیں پھوڑ دیتی۔ مگر وہ بے بسی سے لب کاٹتی رہی۔

”سب! کہاں رہ جاتی ہوں پارٹنر۔ پہلی آواز پر میرے سامنے آ جایا کرو۔ مجھے انتظار مت کرایا کرو۔“ شہر یار نے اسے

محبت سے دیکھتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔



”ایک تو آپ بے صبر رہے بہت ہیں۔“ سبجل نے ہنس کر کہا۔

”ہاں سچ کہا۔ تمہارے معاملے میں واقعی میں بے صبرا ہوں۔“ اس نے معنی خیز جواب دیا جو معصوم سبجل کی سمجھ میں نہ آسکا مگر مشعل اس جملے کا حقیقی مطلب اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اور دل ہی دل میں آگ بگولہ ہو گئی تھی۔

”اچھا اب تو میں آگئی ہوں ناب کہیں کیا بات ہے؟“ سبجل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بات تو تب بنے ڈیر جب تم میرے گھر آ جاؤ۔“ شہر یار نے معنی خیز بات کی۔

”آتی تو ہوں آگ کے گھر۔ تقریباً روز ہی آتی ہوں۔“ اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

”ایسے نہیں، ہمیشہ کے لیے آ جاؤ۔“

”ہمیشہ کے لیے کیسے آ جاؤں؟“

”ہائے میری معصومت محبت، میں تمہیں لے جاؤں گا اپنے گھر پر تو چلو گی نا۔“

”ہاں ضرور چلوں گی۔“ اس نے اسی معصومیت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر اسی خوشی میں یہ فلم تمہاری ہوئی۔ Naked Weapon۔ بڑی زبردست ایکشن مووی ہے۔ دو بہنوں کی

کہانی ہے۔“ شہر یار نے خوش ہو کر سی ڈی اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بتایا۔

”انگلش مووی دیکھنا جاہلوں کا کام ہے۔“ مشعل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”اسی لیے تو میں نے تمہیں آفر نہیں کی۔“ شہر یار نے فوراً جواب دیا تو سبجل ہنس پڑی اور مشعل غصے سے دانت پیس کر رہ گئی۔

”شہر یار بھائی! آپ نے یہ فلم دیکھی ہے؟“ سبجل نے سی ڈی کا کور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں دیکھی ہے۔ جی جی تو تمہیں دکھانے کے لیے لایا ہوں۔“ شہر یار نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”ہو گی وہی مار دھاڑ اور واہیات پن سے بھر پور فلم۔ انگلش فلموں میں یہی گند ہوتا ہے۔“ مشعل کی زبان پر پھر کھلی ہوئی۔

”مار دھاڑ کہاں نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں کی فلموں میں ویسٹ سے زیادہ مضحکہ خیز مار دھاڑ اور واہیات پن ہوتا ہے اس

لیے باہر کی فلمیں دیکھتا ہوں۔ وہاں کی فلم دیکھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ غیر ملک و مذہب کے لوگوں نے بنائی ہے۔ اگر کہیں

واہیات پن ہے بھی تو اپنا نہیں ہے۔ اپنی فلمیں دیکھنے بیٹھو تو بس ایک دوسرے سے نظری ہی چراتے رہو۔“ شہر یار دیکھ سبجل کو رہا تھا

اور بات مشعل سے کر رہا تھا اور مشعل کی نظر تو اس کی ایک ایک حرکت پر ہوتی تھی اور اس وقت بھی تھی اور اسے شہر یار کا اسے نظر

انداز کرنا ہی اپنی توہین محسوس ہو رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ سبجل کو زیادہ توجہ دیتا تھا۔ اس سے پیار جو کرتا وہ اس کے سامنے ہی برملا

اپنے جذلوں کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ اور مشعل کے دل پر سانپ لوٹ جاتے تھے۔

”تھنک یو شیری بھائی۔ میں فلم دیکھ کر واپس کر دوں گی۔“ سبجل نے تشکر سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”واپس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تم گفٹ سمجھ کر اپنے پاس رکھ لو اور دیکھ کر مجھے بتانا کہ کیسی لگی فلم۔ اس میں تمہارا

ایک شوق بھی موجود ہے۔ ہراہم واقعے کو کیمرے میں محفوظ کرنے کا شوق۔“

”سچ، پھر تو میں ضرور دیکھوں گی۔ مجھے تو آپ نے پچھلی سالگرہ پر گفٹ کیا تھا نا ہینڈی کیم (مووی کیمرہ) اس بار کیا دیں

گے مجھے؟“ سبجل نے خوشی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اس بار اپنا آپ دوں گا تمہیں۔“ اس نے بہت واضح اظہار کیا تھا جسے سن کر سبجل تو بے ساختہ ہنس پڑی اور مشعل جل کر

راکھ ہو گئی۔

”اوکے، میں چلتا ہوں پھر ملیں گے۔ بائے۔“ شہریار نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے جانے کے بعد سبجل نے مشعل

سے کہا۔

”مشعل! آؤ فلم دیکھتے ہیں۔“

”تمہارے لیے لایا ہے شہریار، تم ہی دیکھو۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے دوسروں کی لائی چیزیں دیکھنے کا۔“ مشعل نے تلخی

سے کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

”دوسروں کی لائیں ہوئی چیزیں کیسے بھٹی، یہ شیری بھائی لائے ہیں۔ شہریار بھائی تو ہمارے اپنے ہیں۔“

”ہمارے نہیں صرف تمہارے۔“

”ایک تو مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی۔ پتا نہیں کیا کچھ کہتی رہتی ہو۔“ سبجل نے معصومیت سے کہا۔

”تمہیں تو شہریار کی باتوں کی بھی سمجھ نہیں آتی۔ پتا نہیں بے چارہ تم سے کیا کچھ کہتا رہتا ہے۔ خیر تمہاری نا سمجھی بھی میرے

لیے فائدہ مند ہی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب تو وقت آنے پر تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا سبجل اسرار رضا۔“ مشعل نے طنزیہ اور معنی خیز لہجے میں کہا اور اٹھ

کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سبجل نے الجھن آمیز نظروں سے اسے جاتے دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر کمپیوٹر پر سی ڈی چلانے کے

لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

غفار رضا اور دردانہ بیگم کے تین بچے تھے۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ بڑے بیٹے ستار برضا تھے۔ ان کے بعد بیٹی فرزانہ غفار

تھیں اور تیسرے نمبر پر اسرار رضا تھے۔ ستار رضا کی شادی ان کی خالہ کی بیٹی ثمنینہ سے ہوئی تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ذوالفقار رضا

اور شہر یار رضا۔ فرزانہ رضا کی شادی غفار رضا نے اپنے بھائی کے بیٹے جمشید رضا سے کی تھی۔ فرزانہ جمشید کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ اسرار رضا کی شادی ان کے ماموں کی بیٹی کنول سے ہوئی جن کا ایک بیٹا عمار رضا تھا۔ اور ان سے پانچ برس چھوٹی مشعل اور سہل تھیں۔ دونوں جڑواں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے نین نقش، رنگ روپ، قد کاٹھ حیرت انگیز طور پر ایک جیسے تھے۔ اور گھر والے اکثر مشعل کو سہل اور سہل کو مشعل سمجھ لیتے تھے۔ ان کے ملبوستان بھی الگ رنگ اور ڈیزائن کے سلوائے جاتے مگر پھر بھی دونوں کو پہچاننا مشکل ہوتا تھا۔ صورت اور قد کاٹھ تو مشعل اور سہل کے ایک سے تھے مگر مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مشعل اپنے نام کی طرح جلتی، سلگتی رہتی تھی۔ حاسدانہ اور خود غرضانہ مزاج اور رویہ رکھتی تھی جبکہ سہل بے حد نرم ہو، دھیمے لہجے میں شائستگی سے بات کرنے والی ایک زندہ دل، خوش مزاج اور محبت اور خیال کرنے والی لڑکی تھی۔ دونوں نے حال ہی میں بی اے کا امتحان دیا تھا اور آج کل گھر میں فارغ تھیں۔ سہل کا وقت تو بچن کے کام میں اچھا گزر رہا تھا جبکہ مشعل رسالے پڑھنے اور ٹی وی دیکھنے میں زیادہ لچپسی رکھتی تھی۔

فرزانہ بیگم کی بڑی بیٹی کی شادی ذوالفقار رضا سے تین سال پہلے ہوئی تھی اور ان کی ایک بیٹی ثمرین بھابھی کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ اور ذوالفقار بھائی انکم ٹیکس کے محکمے میں بہت اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ فرزانہ بیگم کی دوسری بیٹی کی شادی عمار بھائی سے دو سال قبل ہوئی تھی۔ غبرین بھابھی کا ایک بیٹا بھی تھا۔ موہد بہت ہی پیارا اور شیریں بچہ تھا جو گھر بھر کی جان تھا۔ فرزانہ بیگم کے بیٹے ضار کی شادی ان کے شوہر کی بھانجی صائمہ سے ہو گئی تھی۔ ان کے دو بچے تھے۔ شہر یار شروع دن سے جب سے ان نے شعور کی منزل پر قدم رکھا تھا وہ سہل کو پسند کرتا آ رہا تھا۔ اور اب اس کی پسند محبت میں بدل چکی تھی۔ سہل سب ہی کو اپنی نرم مزاجی اور زندہ دلی کی وجہ سے ذہانت اور معصومیت کے باعث پیاری تھی۔ شہر یار اس سے اور مشعل سے چار سال بڑا تھا۔ حال ہی میں ایم بی اے کرنے کے بعد وہ ایک سرکاری کمپنی میں ملازم ہوا تھا۔ اسرار رضا محکمہ انہار میں اٹھارویں گریڈ کے افسر تھے۔ اور عمار بھائی اسٹیل مل میں مکینکل انجینئر کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ستار رضا بہت کامیاب بیرسٹر تھے۔ دونوں بھائی کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ ایک ایک کینال کے یہ گھر چار سال پہلے انہوں نے نئے سرے سے تعمیر کرائے تھے۔ گھروں کے لان کی دیوار میں ایک دروازہ لگا تھا جو تقریباً ہر وقت کھلا رہتا تھا۔

شہر یار، عمار، مشعل اور سہل ایک ساتھ کھیلتے ہوئے عالم شباب کو پہنچے تھے۔ سہل تو شہر یار کی بہت عزت کرتی تھی۔ اسے ہمیشہ شیریں بھائی یا شہر یار بھائی کہہ کر مخاطب کرتی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا وہ اس سے چار سال بڑا ہے۔ مشعل البتہ اسے نام لے کر ہی اور تم کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ وہ چونکہ بچپن سے ساتھ پلے بڑھے اور کھیلے تھے اس لیے سہل کے دل و دماغ میں شہر یار کے حوالے سے کوئی دوسرا جذبہ اور خیال پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی باتوں کا مطلب اس حوالے سے نہیں سمجھ پاتی تھی جس حوالے سے

وہ اس سے بات کہتا تھا۔ شہر یار اسے بہت پسند اور عزیز تھا مگر اس سے محبت اور شادی کا اس کے ذہن و دل میں دور دور تک کوئی خیا ل نہیں تھا۔ وہ شہر یار کو اپنا بہت اچھا دوست اور بھائی سمجھتی تھی۔ اور شہر یار تو اس کی سیاہ آنکھوں کی گہرائی میں نجانے کب کا ڈوب چکا تھا۔ ہنستی بولتی، سب کا خیال رکھتی نازک سی گڑیا جیسی لڑکی اس کے دل میں بسی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنا لینا چاہتا تھا۔ ستار رضا اور شمیمہ بیگم کی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ سب کو اپنی بہو بنائیں۔ اور بہت جلد وہ اسرار رضا اور کنول سے اس سلسلے میں بات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مشعل بھی سب کی ہم شکل تھی۔ اس کی ہو بہو تصویر تھی۔ پانچ فٹ چار انچ قد تھا دونوں کا۔ گلابی مائل سفید رنگت، تیکھے نقوش تھے۔ سب کے سیاہ ریشمی بال شانوں سے ذرا لمبے تھے۔ اور مشعل کے بالوں کی رنگت ڈارک براؤن تھی البتہ دونوں کے بات کرنے اور ہنسنے کا انداز مختلف تھا۔ مشعل کا لہجہ اور انداز تیز اور شدت پسند تھا اور سب کے دلچسپ اور نرم تھا۔ مشعل کافی عرصے سے شہر یار سے محبت کرتی آرہی تھی۔ دل ہی دل میں اس کے سنگ زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی مگر شہر یار کا رخ سب کی جانب مائل دیکھ کر وہ حسد کی آگ میں جلتی رہتی۔ اسے اپنی بہن اور اپنی سب سے بڑی دشمن سب سے بڑی رقیب دکھائی دیتی۔ جتنا شہر یار سب کی جانب مائل ہوتا اتنا ہی مشعل گھائل ہوتی۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ سب کی شادی شہر یار سے کبھی نہیں ہونے دے گی۔ شہر یار صرف اس کا جیون ساتھی بنے گا اور وہ بھی شہر یار کو ہر قیمت پر حاصل کر کے رہے گی۔ مگر شہر یار کو حاصل کرنے کا طریقہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آج کل وہ اسی الجھن میں گرفتار تھی۔

”اف، کس قدر گرمی ہے شاپنگ کرتے کرتے میں تو تھک ہی گئی۔ سب پانی پلانا بیٹا۔“ کنول بانو اور عنبرین بھابھی شاپنگ کر کے لوٹیں تو کنول بانو لاؤنچ میں داخل ہوتے ہی اسے دیکھ کر کہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور رسالہ پڑھتی رہی۔

”سب۔ ارے سنتی نہیں ہو۔ امی نے پانی لانے کا کہا ہے۔“ عنبرین بھابھی نے اس سے کہا۔

”یہ رسالہ بعد میں حفظ کر لینا۔ پہلے مجھے پانی پلا دو۔ دیکھنا ذرا کیسے کان لپیٹ بیٹھی ہے۔“ کنول بانو کو اس کے اپنی جگہ جے رہنے اور رسالے پر نظریں مرکوز کیے رہنے پر غصہ آ گیا۔ تیز لہجے میں بولیں تو عنبرین بھابھی نے مسکرا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”امی! یہ یقیناً مشعل ہے۔ سب ہوتی تو ہمیں دیکھ کر خود ہی ٹھنڈا پانی لے آتی۔“

”مشعل۔“ کنول بانو نے غصے سے اسے پکارا۔

”کیا ہے واقعی؟“ اس نے جھلا کر پوچھا۔

”میں کتنی دیر سے تمہیں پانی لانے کا کہہ رہی ہوں۔“

”آپ مجھے نہیں سب کو کہہ رہی ہیں۔ اب اگر اس کے دیدوں کا پانی مر گیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور۔“ مشعل نے اکھڑے ہوئے اور بدتمیز لہجے میں جواب دیا۔

”اس کے دیدوں کا پانی تو نہیں مرا۔ لے وہ آگئی پانی لے کر۔ اب تو چلو پھر پانی میں ڈوب مر۔ شرم نہیں آتی مردود، ماں کو پانی تک پلا سکتی۔ پتا نہیں ایسی بری خصلت کہاں سے لی ہے اس نے۔“ کنول بانو نے غصے سے کہا۔ سبجل ٹرے میں اسکو اش کے گلاس سجائے آگئی تھی۔ اس نے ان دونوں کو گلاس پیش کرتے ہوئے کہا۔

”لیس امی اور بھابھی۔ اسکو اش پیئیں اور شاپنگ دکھائیں۔“

”جیتتی رہو میری جان۔ تم تو ہر کام سے مجھے بے فکر کر دیتی ہو۔ کھانے کی خوشبو بتا رہی ہے کہ تم نے کھانا بھی پکا لیا ہے۔“

کنول بانو نے اسکو اش کا گلاس اٹھا کر محبت سے کہا۔

”جی امی۔ کھانا تیار ہے آپ لوگ تھوڑا سا آرام کر لیں پھر سب اکٹھے کھانا کھائیں گے۔“ سبجل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا پکا یا ہے سبجل؟“ عنبرین بھابی نے اسکو اش کا سپ لے کر پوچھا۔

”کڑھی، چاول، آلو قیمہ، روٹیاں، سلاد رائتہ اور چٹنی سب کچھ تیار ہے بھابھی۔ آپ کھانے کے لیے تیار ہو جائیں۔“

سبجل نے مینو بتاتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”سبجل! تم تو واقعی ہماری راحت کا باعث ہو۔ سچ میں تو سوچ رہی تھی کہ ابھی گھر جا کر سالن پکانا پڑے گا۔ عمار آلو قیمہ کی فرمائش کر رہے تھے اور ابو نے کڑھی کا کئی دن سے کہہ رکھا تھا۔ تم بہت سگھڑ ہو۔ میری بہن جس گھر میں جائے گی راحت اور فرحت پہنچائے گی گھر والوں کو۔ تمہارے میاں تو تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیا کریں گے۔“

”اوہ۔ گندے۔“ سبجل نے برا سامنہ بنایا تو دونوں ہی ہنس پڑیں۔

”سچ سبجل۔ میری دلی دعا ہے کہ تمہارا شوہر تمہیں بہت محبت اور عزت دے۔ اتنی خوشیاں دے کہ تم سے سنبھالے نہ سنبھلیں۔“ عنبرین بھابی نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر دل سے محبت سے کہا تو وہ شرمیلے پن سے مسکراتی ہوئی بولی۔

”آمین۔“

”بھابھی۔ ساری دعائیں صرف سبجل کے لیے ہی ہیں۔“ مشعل نے تلخی سے کہا۔

”تم کوئی سبجل سے الگ تھوڑی ہو۔ جو دعائیں سبجل کے لیے ہیں وہی تمہارے لیے بھی ہیں۔“ عنبرین بھابی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”رہنے دیجئے، آپ سب کو تو سبجل ہی زیادہ پیاری ہے۔ کیا کمی ہے مجھ میں؟“

”کوئی کمی نہیں ہے تم میں۔ تم اصل میں ٹیکٹو بہت سوچتی ہو۔ تمہاری شکل صورت، تعلیمی قابلیت کسی طرح بھی سبجل سے کم نہیں ہے۔ گہا گراے گریڈ لیتی ہے تو تم بی لیتی ہو۔ یہ انیس، بیس کا فرق تو ہوتا ہے ہر انسان میں۔ تم سب سے دوستوں کی طرح ملا

کرو، بات کیا کرو۔ دوسروں کے بارے میں منفی سوچ مت رکھا کرو۔ خاص کر اپنے گھر والوں کے بارے میں۔ انسان اپنے رویے سے ہی دوسروں کے دل میں جگہ بناتا ہے۔“ عنبرین بھابھی نے اسے نرمی سے سمجھایا۔  
”اور دوسروں کے جگہ ہے تو صرف سچل کے لیے۔“ مشعل نے سلگ کر کہا۔

”تم نے کبھی ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچا کہ ایسا کیوں ہے۔ جب یہ تمہاری بہن ہے، تمہاری ہم شکل ہے تو یہ سب کو زیادہ پیاری کیوں ہے۔ صرف اور صرف اپنے مثبت، محبت اور اپنائیت بھرے رویے کی وجہ سے۔ پیار تو ہم سب تم سے بھی کرتے ہیں مگر تم ہمارا اعتبار نہیں کرتیں۔ اپنوں پر اعتبار کرنا ان سے پیار کرنا سیکھو مشعل، پھر دیکھنا تمہیں کتنی خوشی ملتی ہے۔“ انہوں نے پیار سے سمجھایا۔

”پلیز بھابھی۔ مجھے لیکچر یا نصیحت مت کیا کریں۔ میں بچی نہیں ہوں سب سمجھتی ہوں۔“ وہ بدتمیزی سے بولی۔  
”سمجھتی ہی تو نہیں ہوتی۔“

”افوہ۔ عبر بھابھی چھوڑیں نا اس بحث کو، منہ ہاتھ دھولیں۔ پھر کھانا کھائیں گے۔ قسم سے مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ سچل نے کہا۔

”بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے اور تمہارے ہاتھ کے مزیدار کھانے کھا کر مجھے لگتا ہے کہ میں موٹی ہو جاؤں گی۔“  
”آپ مکھن لگا رہی ہیں مجھے۔“ سچل ہنسی۔

”ارے نہیں میری جان۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ تم بہت اچھی کک ہو۔ میاں کے دل پر ہی نہیں معدے پر بھی قبضہ جما لو گی۔“ عنبرین بھابھی نے اس کے رخسار کو چھوتے ہوئے کہا۔  
”بھابھی۔“ وہ شرمائی۔

”اچھا ہاں وہ میرا ڈراما مود کہاں ہے؟“ عنبرین بھابھی کو ایک دم یاد آیا تو پوچھا۔  
”مود دودھ پی کر سو گیا تھا۔ بہت شرارتی ہو گیا ہے۔ پکوڑے کھانے کی فرمائش کر رہا تھا۔ میں نے اسے پکوڑے پکا کر کھلائے تو کھا کر تھوڑا سا دودھ پیا اور سو گیا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ”شکریہ۔ ویسے تم سے وہ بہت اٹیچڈ ہو گیا ہے۔ دوسرے گھر جاؤ گی تو وہ مجھے تنگ کیا کرے گا۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دوسرے گھر کیوں۔ وہ گھر بھی تو اس کا اپنا ہی ہے۔ روز کا آنا جانا رہے گا۔“ کنول بانو نے سکون سے اسکو اش ختم کر کے کہا۔

”میں بھی دیکھوں گی کہ کیسے جائے گی سچل اس دوسرے گھر۔ شہر یا صرف میرا ہے۔ سچل کو اس کے گھر تو میں کبھی نہیں

جانے دوں گی۔“ مشعل نے دل ہی دل میں سازشی انداز میں سوچتے ہوئے کہا۔

”مشعل! اب تم بھی اس رسالے کی جان چھوڑ دو۔ بہن نے سارا کام اکیلے ہی کر لیا تم سے کچھ نہیں ہوسکا۔“ کنول بانو نے مشعل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ مجھے سب کی طرح نمبر بنانے اور دوسروں کی واہ واہ پانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ مشعل نے رسالہ بند کرتے ہوئے کہا۔

”تو بہ ہے جب بھی بولے گی الٹ ہی بولے گی۔ اللہ جانے اس لڑکی کے سر میں کیا سمایا ہے؟“ کنول بانو نے شاپنگ کی چیزیں دیکھتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

”سر میں نہیں امی دل میں سمایا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے پراسرار لہجے میں بولی۔

”ہمیں بھی تو پتا چلے کہ دل میں تمہارے کون سمایا ہے؟“ سب نے شریر لہجے میں پوچھا۔

”پتا چلے گا تمہیں ضرور پتا چلے گا لیکن وقت آنے پر۔“ مشعل نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو غبرین بھابھی نے بہت چونکتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا مگر وہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکیں۔ الجھ کر ہی رہ گئیں۔

”بھابھی جان۔“ سب نے انہیں پکارا تو وہ اس الجھن سے باہر نکل آئیں۔

”ہوں۔“ سب نے یہ دیکھو یہ سوٹ کیسا ہے؟“ انہوں نے شاپنگ بیگ سے ایک سوٹ نکال کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

”بہت پیارا ہے، کس کا ہے؟“

”خرید اتو میں نے اپنے لیے ہے لیکن اگر تمہیں پسند ہے تو تم لے لو میں اور خرید لوں گی۔“

”نہیں بھابھی جان۔ یہ سوٹ آپ پر ہی سوٹ کرے گا۔“

”خوش رہو۔ اچھا آنکھیں بند کرو میرے پاس تمہارے لیے ایک زبردست تحفہ ہے۔“ انہوں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر

پیار بھرے انداز میں کہا۔

”تحفہ، تو جلدی دکھائیں ناں۔“

”پہلے آنکھیں بند کرو۔“

”لیں کر لیں بند۔“ اس نے آنکھیں بند کر لیں تو انہوں نے اپنے شولڈر بیگ میں سے ایک مخملی ڈبیہ نکالی اور کھولی تو اس

میں سونے کا لاکٹ چمکتا دیکھ کر مشعل اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔

”اب آنکھیں کھول کر دیکھو۔“



”اللہ بھائی، اتنا پیارا لاکٹ ہے۔ یہ تو میرا نام لکھا ہے اس پر۔“ اس نے آنکھیں کھول کر لاکٹ دیکھا تو پکڑ کر خوشی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ میں نے خاص طور پر تمہارے لیے بنوایا ہے۔ یہ گفت تو میں نے تمہیں تمہاری برطڈے پر دینا تھا مگر ایڈوانس دے رہی ہوں۔ برتھ ڈے پر کچھ اور دے دوں گی۔“

”تھینک یو سوچ بھابھی، آئی لو یو بھابھی۔“ وہ خوش ہو کر ان کے گلے سے لگ گئی۔

”آئی لو یو میری جان۔ تمہاری اور مشعل کی شکلوں کی وجہ سے بہت مشکل ہوتی ہے پہچاننے میں اسی لیے میں نے لاکٹ پر تمہارا نام کندہ کرایا ہے تاکہ تمہارا تو آسانی سے پتا چل سکے۔“ وہ اس کا ماتھا چوم کر بتا رہی تھیں۔

”کہا بھی تھا سبھل سے کہ اپنے بالوں کو کٹوائے، کوئی ہیئر اسٹائل بنالے تاکہ ان کی پہچان میں آسانی ہو مگر اسے اپنے بالوں سے بہت پیارا ہے۔“ کنول بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کے بال ہیں بھی تو بہت پیارے امی، کیسے ریشم سے ہیں۔ اور مشعل کے بالوں کی رنگت مختلف ہے پھر ہم دھوکا کھا جاتے ہیں۔ مشعل، یہ لویہ پر فیوم تمہارے لیے لائی ہوں۔ تمہیں پسند ہے نا۔“ عنبرین بھابھی نے مسکراتے ہوئے کہا اور ”اٹرنٹی“ کی شیشی اس کی طرف بڑھادی۔

”تھینکس۔ میرا خیال تھا کہ آپ مجھے بھی لاکٹ ہی دیں گی۔“ وہ پر فیوم لے کر بولی۔

”وہ تو میں تمہیں ڈھائی ماہ بعد دوں گی تمہاری برتھ ڈے پر۔ تب تک پیسے جمع ہو جائیں گے۔ سبھل کے گلے میں یہ لاکٹ موجود ہوگا تو ہمیں اس کا پتا چل جائے گا۔ پھر تمہارا تو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ تم مشعل ہو۔“

”جو ہر وقت جلتی رہتی ہے۔“ شہریار کی آواز پر سب نے دروازے کی جانب دیکھا۔

”لیجئے آگئے سبھل کے ایک اور چاہنے والے۔“ مشعل نے طنزیہ لہجے میں کہا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

”مشعل! سوچ سمجھ کر بولا کرو۔“ کنول بانو نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ لا پرواہی سے سر جھٹک کر پر فیوم کھول کر سونگھنے لگی۔

”السلام علیکم معزز خواتین۔“ شہریار نے سب کو دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام آؤ شہریار۔“ کنول بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شہریار کو تو شہریار میں ہی سکون ملتا ہے۔“

عنبرین بھابھی اس کی دلی کیفیت اور اس کے گھر والوں کے ارادوں سے واقف تھیں اس لیے شوخ لہجے میں معنی خیز جملہ کہا تو وہ ہنس کر بولا۔



”بھابھی۔ آپ تو میری نبض شناس ہو گئی ہیں۔“

”شیری بھائی۔ یہ دیکھیں بھابھی نے مجھے برتھ ڈے گفٹ ایڈوانس دے دیا ہے۔ پیارا ہے نالا کٹ۔“ سبیل نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے لاکٹ اسے اس کے پاس جا کر دکھایا تو وہ اس کا نام کندہ دیکھ کر لاکٹ ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔

”ہوں۔ بہت پیارا ہے۔ بھابھی! آپ تو سبقت لے گئیں مجھ سے۔ ایسا لاکٹ تو میں سبیل کے لیے بنوانے کا سوچ رہا تھا۔“ شہر یار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا واقعی۔“ عنبرین بھابھی ہنس دیں۔ مشعل کی جلن دیدنی تھی۔

”اور کیا؟“

”آپ سوچتے رہ گئے اور بھابھی نے مجھے لاکٹ بنوا بھی دیا۔“ سبیل نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ اسے والہانہ پن سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”چلو کوئی بات نہیں، میں تمہارے لیے کچھ اور بنوا لوں گا۔ لاکٹ کا بھی کوئی اچھا سا ڈیزائن دیکھوں گا لاکٹ بھی ضرور بنواؤں گا۔“

”پھر کب دیں گے؟“ سبیل نے خوشی اور جوش سے پوچھا۔

”تمہاری برتھ ڈے پر۔ ٹھیک ہے نا۔ چچی جان! یہی تاریخ دیجئے گا ہمیں۔“ شہر یار نے مسکراتے ہوئے پہلے اسے اور پھر کنول بانو کو دیکھتے ہوئے معنی خیز جملہ کہا۔

”انشاء اللہ، اللہ وہ دن تولائے۔“ کنول بانو نے دل سے کہا۔

”کون سا دن امی؟“ سبیل نے نا سمجھی کے عالم میں انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری رخصتی کا دن۔“ انہوں نے ہنس کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہی۔ ہاں۔“ اس نے نظریں جھکا کر خفگی سے کہا۔

”تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ ہماری نظروں کے سامنے ہی رہو گی ہمیشہ۔ اس بات کی تو ہمیں زیادہ خوشی ہے۔“ وہ معنی خیز بات کہتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ شہر یار بھی اسے اپنی نظروں کی گرفت میں لیے مسکرا رہا تھا اور مشعل کی آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ تو سبیل کو شوٹ کر دیتی۔ اور شہر یار کو اپنا بنا لیتی۔ اس کا محبوب اس کا بہنوئی بن کر اس کے سامنے اس کی بہن سے اظہارِ محبت کرتا رہے یہ اسے کسی طور گوارہ نہیں تھا۔

”اچھا میں کھانا لگاتی ہوں آپ لوگ ہاتھ منہ دھو کر ڈائننگ ٹیبل پر آ جائیں۔“ سبیل نے لاکٹ عنبرین بھابھی کے ہاتھوں

سے گلے میں پہنتے ہوئے کہا۔

”میں چلتا ہوں پھر۔“ شہریار نے فوراً کہا۔

”نہیں شیری بھائی۔ کھانا کھا کر جائیے گا۔ میں نے قیمہ اور کڑھی، چاول پکائے ہیں۔ آپ شوق سے کھاتے ہیں ناں۔“

سجل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری پکائی ہوئی تو میں ہر ڈش ہی شوق سے کھاتا ہوں۔“ شہریار نے اسے چاہت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو پھر آجائے۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی اور کچن کی طرف چلی گئی۔ کنول بانو بھی اس کے پیچھے

ہی چلی گئیں۔

”تم بھی اس کا ہاتھ بٹا دیا کرو۔“ شہریار نے مشعل سے کہا۔

”تم جو ہو پھر بھلا مجھے کیا ضرورت ہے اس کا ہاتھ بٹانے کی۔“ اس نے تپ کر کہا۔

”ہاں یہ بھی تم نے ٹھیک کہا۔ میں تو ساری زندگی اس کا ہاتھ بٹاؤں گا۔“ شہریار نے مسکراتے ہوئے معنی خیز بات کہی۔

”ہونہہ، ساری زندگی۔ وہ تمہارے ہاتھ آئے گی تو اس کا ہاتھ بٹاؤ گے نا۔“ مشعل نے دل میں کہا اور اپنے کمرے میں

چلی گئی۔

”شیری بیٹا آ جاؤ۔ کھانا لگ گیا ہے۔“ کنول بانو نے آواز دے کر کہا تو وہ بھی ڈانٹنگ روم میں چلا گیا۔

بالا ہی بالاسجل اور شہریار کی بات طے ہو گئی تھی اور سجل کو خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ ثمنینہ بیگم اور ستار رضا ایک دودن میں منگنی

کرنے آنے والے تھے اور ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی طے کرنے کا ارادہ تھا۔ مشعل بے بسی سے یہ سب کچھ ہوتے دیکھ رہی

تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیا کرے کہ شہریار کی شادی سجل کی بجائے اس سے ہو جائے۔ رات کو لاؤنج میں سب

گھر والے موجود تھے۔ اسرار رضائی وی پر خبر نامہ دیکھ رہے تھے۔ سجل ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی۔

”ابو! ہم مری، سوات اور مالم جبہ کب جائیں گے؟“

”ہم سے کیا مراد ہے ہماری بیٹی کی بھئی۔ تم اور شہریار ہی جاؤ گے شمالی علاقہ جات کی سیر کو۔“ اسرار رضا نے اسے دیکھتے

ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں، میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ اور ابو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جب ہمارے بی اے کے امتحان ختم ہو جائیں

گے تو آپ ہمیں مری، سوات اور مالم جبہ کی سیر کو لے جائیں گے۔“ اس نے معصومیت سے انہیں دیکھتے یاد دلایا تھا۔

”میں نے وعدہ کیا تھا۔“ وہ مسکرائے۔

”جی ابو، اور اب تو مہینہ ہو گیا ہے ہمارے امتحان ختم ہوئے۔ بس آپ ہمیں سیر کے لیے لے کر چلیں ناں۔ پلیز ابو جان۔“ وہ ان کا بازو پکڑ کر بڑی معصومیت اور محبت سے فرمائش کر رہی تھی۔ اسرار رضانے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کنول بانو سے مخاطب ہوئے۔

”کیوں بھئی کنول بیگم۔ آپ نے ہماری بیٹی کو کچھ نہیں بتایا شہریار کے متعلق؟“  
 ”نہیں بتایا اسی لیے تو جانے کی فرمائش کر رہی ہے۔“ کنول بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”ہوں۔ سب مل بیٹا۔ کیا خیال ہے اگر دو ڈھائی ماہ بعد آپ کو ان مقامات کی سیر کے لیے لے جایا جائے تو.....“ وہ شہریار سے اس کی شادی کے بعد ’ہنی مون‘ پر جانے کے خیال سے کہہ رہے تھے۔

”لیکن ابو، تب تو ہمارے یونیورسٹی میں ایڈمیشن شروع ہو جائیں گے۔ اور میں برف باری دیکھنا چاہتی ہوں۔ ابھی تو چھٹیاں ہیں بعد میں پھر پڑھائی کی فکر پڑ جائے گی۔“ سب نے اپنے نرم لہجے اور معصوم لہجے میں کہا تو انہیں اس کی لاعلمی اور معصومیت پر ہنسی آگئی۔ پھر وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نرمی سے بولے۔

”ہماری بیٹی تو بہت ذہین اور لائق ہے۔ اسے پڑھائی کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ہم تو تمہارے لیے کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ یہاں تو کچھ اور ہی تیاری کر رہے تھے۔“

”ہاں اور اس تیاری میں خاصا خرچہ ہو جائے گا۔ یہ سیر کا پروگرام فی الحال کینسل ہی کر دیں۔“ کنول بانو نے سنجیدگی سے کہا۔

”خرچہ تو ہو گا بیگم۔“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”یہ شہریار کے ساتھ چلی جائے گی بعد میں۔“ ان کا اشارہ ہنی مون کی طرف تھا۔  
 ”آپ لوگ مجھے شہریار بھائی کے ساتھ کیوں بھیجنا چاہ رہے ہیں۔ میں آپ سب کے ساتھ چلوں گی۔ تایا ابو اور تائی امی بھی ساتھ جائیں گے۔“ سب نے کہا تو مشعل سوچتے ہوئے پہلی بار اس گفتگو میں شریک ہوئی۔

”ابو! مان لیں ناں سب کی بات۔ اکٹھے سیر کرنے کا اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔“  
 ”جی ابو۔ آپ نہ مان کرو وعدہ خلافی کر رہے ہیں۔“ سب نے خفگی سے کہا۔

”اوہو۔ نہیں سہی ہم وعدہ خلافی ہرگز نہیں کر سکتے۔ اپنی بیٹی سے ہم نے وعدہ کیا تھا تو ہم سب سیر کے لیے مری، سوات اور مالم جبہ ضرور جائیں گے۔“ اسرار رضانے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ دونوں خوش ہو گئیں۔  
 ”سچ ابو۔“ سب خوشی سے چیخیں۔

”جی ابو کی جان بالکل سچ۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ابو زندہ باد۔“ سچل نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ مشعل جانے کن خیالوں میں گم بیٹھی تھی۔

”اسرار! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ فی الحال ان عیاشیوں کے لیے ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے۔ شادی بیاہ میں لاکھوں

خرچ ہو رہے ہیں۔ اور شہر سے باہر جا کر ٹھہرنے، کھانے پینے کے اخراجات الگ ہوں گے۔“ کنول بانو نے سنجیدگی سے کہا۔

”کوئی بات نہیں بیگم۔ اللہ مالک ہے اور یہ تو گھر کی بات ہے۔ ہماری بیٹیوں کی خوشی سے بڑھ کر تو نہیں ہے پیسہ اور پھر

پہلی بار یا شاید دوسری بار ہم سیر کے لیے مری جائیں گے۔ اچھا ہے سب تازہ دم ہو جائیں گے۔“ اسرار رضا نے نرمی سے کہا۔

”ابو! اگر پیسوں کا مسئلہ ہے تو رہنے دیں پھر سہی۔“ سچل نے ان کی باتیں سن کر کہا۔

”ارے نہیں بیٹا، تمہاری ماں کو تو بچت کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہم ضرور جائیں گے مالم جبہ اور مری، تم سب تیاری کرو۔“ وہ

اس کا سر تھپک کر بولے۔

”تھینک یو ابو۔ ابو، میں اپنا کیمرو اور ہینڈی کیپ کیمرو ضرور ساتھ لے جاؤں گی۔ تصویریں کھینچوں گی۔ فلم بناؤں گی۔“

اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کر بتایا۔

”ضرور بنانا فلم۔“ وہ اسے خوش دیکھ کر خود بھی خوشی سے ہنس دیئے۔

اور پھر سب کو جانے کی تیاری کی جلدی پڑ گئی۔ شہر یار نے سنا تو فوراً اس کے پاس چلا آیا۔ وہ لان میں موہد کے ساتھ

کھیل رہی تھی اور اس کی اپنے ہینڈی کیپ کیمرو سے فلم بن رہی تھی۔

”یہ تمہیں اچانک مری جانے کی کیا سوجھی ہے؟“ شہر یار نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”اچانک تو نہیں، یہ تو ہمارے امتحانات شروع ہونے سے پہلے ہی طے ہو گیا تھا۔ ابو نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔“ اس نے

کیمرو آف کرتے ہوئے بتایا۔

”ہوں۔ سچل! امی ابو آج تمہارے گھر آ رہے ہیں۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔

”وہ تو روز آتے ہیں۔“

”آج خاص مقصد کے لیے آ رہے ہیں۔“

”خاص مقصد۔“ اس نے نا سمجھتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”ہاں۔ وہ چچا اور چچی جان سے تمہیں میرے لیے مانگنے آ رہے ہیں۔ بلکہ منگنی کرنے آ رہے ہیں ہماری۔“

”منگنی۔“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

”جی جناب، اور انشاء اللہ شادی کی تاریخ بھی لے کر ہی جائیں گے۔“ وہ خوشی سے بتا رہا تھا۔

”او، تو یہ بات تھی۔“ اسے امی، ابو اور بھابھی کی اور شہریار کی معنی خیز باتیں اب سمجھ میں آئی تھیں۔ اس کا چہرہ خود بخود حیا سے دھنک رنگ ہو گیا۔

”ہاں سہل، تمہیں اپنا نام میری زندگی کی اولین خواہش ہے بلکہ سب کی یہی خواہش ہے اور میری خوشی ہے یہ۔ سہل، تم میری دلہن بنو گی نا۔“ وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

”مم۔ مجھے کیا پتا۔“ وہ ٹپٹا گئی۔

”تو اور کسے پتا ہے؟“ وہ اسے محبت اور دلچسپی سے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”امی ابو کو پتا ہو گا۔“

”ان کا جواب تو ہاں میں ہے۔ تم تو ”ناں“ نہیں کرو گی نا۔“

”جب امی، ابو نے ”ناں“ نہیں کی تو میں کیوں کروں گی۔“ اس نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے کہا اور شرما کر اندر کی جانب بھاگ گئی۔

”اے موہد کو تو ساتھ لیتی جاؤ۔“ شہریار نے خوشی سے ہنستے ہوئے کہا۔

”آپ خود ہی لے آئیں۔“ اس نے مڑ کر جواب دیا تو وہ ہنس پڑا۔

”آؤ موہد بیٹا، آپ کو آپ کی ماما کے پاس لے جائیں۔ آپ کی پھوپھو تو شرما کر بھاگ گئیں۔“ شہریار نے مسکراتے ہوئے دو سالہ موہد کو دیکھ کر کہا اور اسے اپنی بانہوں میں اٹھالیا۔

اسی شام ثمنینہ بیگم اور ستار رضا نے سہل کو شہریار کے نام کی انگوٹھی پہنا دی اور سہل کی بیسیویں سالگرہ کے دن ان کی شادی ہونا طے پا گئی۔ سہل کے دل میں عجیب سے احساسات سر اٹھ رہے تھے۔ اسے شہریار کی معنی خیز باتوں کا مطلب اب سمجھ میں آ رہا تھا اور اس کے لبوں پر شرمیلی مسکان بکھیر رہا تھا۔ مشعل اندر ہی اندر جل رہی تھی۔ اسے سہل کا وجود زہر لگ رہا تھا۔ شہریار کی خوشی سے چڑھ رہی تھی۔ مشکل کے علاوہ سب ہی بہت خوش تھے اس رشتے سے۔

”تم جلتی کر رہتی رہنا مشعل اور سہل شہریار کی دلہن بن جائے گی۔“ مشعل کے اندر سے آواز اٹھی تو وہ بے کل اور بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔

”نہیں ایسا کبھی نہیں ہو گا۔“ وہ با آواز بولی۔

”کیا نہیں ہو گا؟“ سہل نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے پوچھا۔

”تم سوئی نہیں اب تک؟“ مشعل نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ہاں، مجھے نیند نہیں آرہی لیکن تم بھی تو جاگ رہی ہو۔“ سبل نے اس دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”مجھے بھی نیند نہیں آرہی۔“

”کیوں؟“

”بہت خوش ہو تم شہر یار سے منگنی ہونے پر۔ ہے نا۔“ مشعل نے کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔  
 ”تم خوش نہیں ہو کیا؟“

”منگنی تمہاری ہوئی ہے میری نہیں کہ میں خوش ہوتی پھروں۔“ اس نے تلخی سے جواب دیا۔

”تمہیں میری منگنی کی بھی خوشی نہیں ہوئی۔ شہر یار تو بہت اچھے ہیں۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔“  
 اس نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چلو اب تو پتا چل گیا نا۔“ مشعل نے طعنیہ لہجے میں کہا۔

”لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ سبل نے مسکرا کر کہا۔ حالانکہ اس کا لہجہ اور انداز اسے حیران اور پریشان کر رہا تھا۔

”طبیعت یا نیت۔ میری نیت ٹھیک نہیں ہے کہہ دو۔“ وہ غصے سے بولی۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ پتا نہیں تمہیں کس بات کا غصہ ہے۔ میں چلتی ہوں تم آرام کرو۔“ اس نے حیرت اور تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں اگر میرا آرام عزیز ہے تو یہاں سے چلتی ہی بنو۔“ مشعل نے ذومعنی بات کہی اور وہ اسے الجھن آمیز اور حیرت

زدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔ وہ لاؤنچ میں بیٹھی مشعل کی باتوں اور اس کے رویے پر غور کر رہی تھی کہ غبرین  
 بھا بھی وہاں سے گزریں۔ اس پر نظر پڑی تو وہیں چلی آئیں۔

”سبل! کیا بات ہے چندا تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟“ انہوں نے پیار سے پوچھا۔

”بھابھی! مجھے لگتا ہے کہ مشعل میری منگنی سے خوش نہیں ہے۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

”وہ تو کسی سے بھی خوش نہیں ہوتی۔ تم اس کی باتوں کو دل پر نہ لیا کرو۔ آہستہ آہستہ خود ہی سمجھ جائے گی۔“ غبرین بھا بھی

نے نرمی سے کہا۔

”بھابھی، آپ سب لوگ خوش ہیں اس منگنی سے۔“

”ہاں۔ ہم سب تو بہت خوش ہیں۔ اور شہر یار تو تمہیں برسوں سے چاہتا چلا آ رہا ہے۔ وہ بھی بہت خوش ہے اور سب سے

بڑھ کر خوشی کی بات یہ ہے کہ تم اس خاندان کو مضبوط بناؤ گی اور ہماری نظروں کے سامنے ہی رہو گی۔ اور سبجل جان! تم خوش نہیں ہو کیا۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
”میں تو خوش ہوں بھابھی مگر مشعل.....“

”چھوڑو مشعل کو۔ اس کی تو ہمیشہ سے ہی رنگ میں بھنگ ڈالنے کی عادت ہے۔ خوشی میں غمی اور افسردگی کی صورت حال پیدا کر دیتی ہے۔ پتا نہیں کیوں جلتی کڑھتی ہے۔ تم اس کی وجہ سے اپنی خوشی خراب مت کرو۔ جلنے دوا سے، جل جل کر خود ہی بجھ جائے گی۔“ عزیزین بھابھی نے سنجیدگی سے سمجھایا تو وہ گہرا سانس لے کر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اور پھر دو دن بعد سب ہنسی خوشی سیر کے لیے روانہ ہو گئے۔ میری اور سوات کے بعد اب وہ مالم جبہ میں تھے۔ خوبصورت وادی کا خوبصورت موسم انہیں تازہ دم کر گیا۔ برف باری کے اس موسم میں مالم جبہ میں سکیننگ کے مقابلے منعقد ہو رہے تھے۔ شہر یار، ذوالفقار اور عمار بھائی نے بھی شغل کے طور پر ان مقابلوں کی فوٹو گرافی کی اور ان مقابلوں میں حصہ لے رہے تھے۔ سبجل نے اپنے کیمرے سے سب کے ساتھ تصاویر کھینچی تھیں۔ اپنے ساتھ وہ چھوٹا سفری بیگ ہر وقت لیے پھرتی۔ اس میں اس نے موسم کی مناسبت سے ایک دو گرم سوٹ، کیمرے، خشک میوے اور دوسری چھوٹی موٹی کھانے پینے اور ضرورت کی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ کل وہ لوگ واپس جا رہے تھے۔ آج آخری بار وادی کی سیر کو نکلے تھے۔ ہلکی ہلکی بوند باندی کے بعد برف باری بھی شروع ہو گئی تھی۔ سبجل نے سب سے زیادہ گرم کپڑے جرسی، سوئیٹر یکنگ پہن رکھی تھی۔ اوپر اور کوٹ اور سر پر گرم سکارف باندھ رکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں مووی کیمرا ہینڈی کیم تھا اور دوسرے میں اسٹیل فوٹو گرافی کا کیمرا۔ بیگ سائیڈ پر لٹکا رکھا تھا۔

”سبجل بیٹا! اندر آ جاؤ۔ برف باری شروع ہو گئی ہے ٹھنڈ لگ جائے گی۔“ اسرار رضا نے ریٹ ہاؤس کے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے لان میں کھڑے دیکھ کر کہا۔ اس کا ہینڈی کیم اس کے ہاتھ میں تھا۔  
”بس ابو، ایک آخری راؤنڈ لگا لوں پھر آ جاؤں گی۔ دیکھیں کتنا پیارا منظر ہے۔ میں اس کی فلم بنالوں ابو۔“ اس نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا لیکن دیکھو۔ زیادہ دور مت جانا۔ یوں بھی اندھیرا پھیل رہا ہے۔“ اسرار رضا نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے ہدایت کے ساتھ اجازت دے دی۔

”تھینک یو ابو، بس میں دس منٹ میں آ جاؤں گی۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔  
”رکوسجل، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔“ شہر یار نے اس کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔  
”آپ کو میرے ساتھ چلنے سے کون روک سکتا ہے؟“ سبجل نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔



”میں روک سکتی ہوں۔“ مشعل بھی نجانے کدھر سے نکل آئی۔ شہریار کا موڈ اسے دیکھتے ہی آف ہو گیا اور وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہیں کباب میں ہڈی بننے کا بہت شوق ہے۔“

”ہڈی میں نہیں ہوں کوئی اور ہے اور سبجل تم نے چلنا ہے یا نہیں پھر ابو نہیں جانے دیں گے۔ برف باری تیز ہو جائے گی۔“ مشعل نے معنی خیز بات کہہ کر سبجل کو مخاطب کیا۔

”ہاں چلو۔ اگر تم دونوں بھی میرے ساتھ جانا چاہو تو۔“

”مشعل کے ہوتے ہوئے تو میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔ بہت بور کرتی ہے یہ لڑکی۔ کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کر سکتا بندہ اس کے سامنے۔“ شہریار نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا۔ مشعل کا تو پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

”تمہاری ڈھنگ کی بات کا مجھے خوب علم ہے اور تمہیں میری انسٹ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ سمجھے۔“ مشعل نے اپنے غصے کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری انسٹ نہیں کر رہا مشعل ڈیر، میں تو تمہیں تمہاری عادت اور حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں۔“ شہریار نے اسے دیکھتے ہوئے صاف گوئی سے کہا۔

”میری حقیقت کیا ہے یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں تمہیں آگاہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”آپ دونوں لڑتے رہیں میں جلدی سے فلم بنا کر آتی ہوں۔“ سبجل نے کہا۔

”سبجل! دھیان سے جانا اور جلدی آجانا اور یاد رکھنا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں صرف تم سے سبجل آئی رینی لویو۔“ شہریار نے مشعل کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر برملا اس سے اظہارِ محبت کر دیا۔ سبجل تو خوشی اور حیا سے مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی جبکہ مشعل کی سوچ بہت گہری کھائی میں جا گری۔ شہریار تو اس کے دل پر تیر چلا کر چلا گیا تھا مگر وہ سبجل کے پیچھے آگئی تھی۔ سبجل برف باری کے منظر سے ڈھکے پہاڑ اور درختوں کو اپنے بینڈی کیم کیمرے میں فلم بند کر رہی تھی۔

”واؤ کتنا دلکش منظر ہے مشعل، تمہاری اس منظر میں مووی بناؤں؟“ سبجل نے پہاڑوں اور درختوں کے خوبصورت منظر کو دیکھ کر ایک جگہ رک کر کہا۔

”ہاں بناؤ اور اچھی سی مووی بنانا۔“ مشعل نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے سامنے آگئی۔ سبجل ایک فلم خوبصورت مناظر میں بنانے لگی۔

”سبجل، نیچے وادی تو اور بھی زیادہ دلفریب ہے اس پر بھی کیمرہ ڈالو نا۔“ مشعل نے وادی کے برف اور سبزے سے



ڈھکے چھوٹے چھوٹے کاٹھڑ کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے کیمرے کا رخ نیچے کے مناظر کی جانب کر دیا۔ وہ دونوں برف کی سڑک پر کنارے پر بہت اونچائی پر کھڑی تھیں۔

”واؤ زبردست۔ مشعل نیچے بھی لوگ رہتے ہیں ناں۔“ سبل نے کیمرے کی آنکھ سے نیچے وادی کا منظر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں لوگ تو اوپر نیچے سب جگہ پر ہی رہتے ہیں۔ ویسے سبل اگر تم اس اونچائی سے اس بلندی سے نیچے جا گرو تو جانتی ہو

تمہارا کیا بنے گا؟“

”میرا قیمہ ہی بن جائے گا۔“ اس نے کیمرے کا رخ اس کے چہرے کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

”اور میرا مستقبل بن جائے گا۔“ مشعل نے معنی خیز جملہ بولا۔

”مطلب۔“ سبل نے کیمرہ اس کے چہرے پر فوکس کیا۔

”مطلب یہ کہ تم یہاں سے گر کر مر جاؤ گی اور میں شہر یار کو پا کر جی اٹھوں گی۔“

”مشعل، کیا کہہ رہی ہو تم؟“ سبل نے حیرت سے پوچھا۔

”وہی جو تم سن رہی ہو۔ میں شہر یار کو بہت عرصے سے چاہتی آرہی ہوں۔ میں محبت کرتی ہوں اس سے اور اس کی منگنی تم

سے کر دی گئی ہے جو میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔“ اس نے غصیلے اور تلخ لہجے میں کہا۔ سبل پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے مگر

اس نے اپنی کیفیت اس پر ظاہر کیے بغیر نارمل لہجے میں کہا۔

”تو تم نے مجھے پہلے بتانا تھا نا میں امی ابو اور شہر یار کو منالیتی۔ تمہاری منگنی شہر یار سے کرا دیتی۔“

”شہر یار ہرگز نہیں مانتا کیونکہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔“

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”تم میرے لیے مر سکتی ہو سبل۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ سبل نے اس کے چہرے سے کیمرہ ہٹایا نہیں تھا۔ اب تک سب کچھ کیمرے میں فلم بند ہو رہا تھا۔

”اتنی نا سمجھ تو نہیں ہو تم۔ جب تک تم شہر یار کے سامنے رہو گی وہ مجھ سے کبھی شادی نہیں کرے گا۔ تمہیں میرے راستے

سے ہٹنا ہو گا سبل۔ میں تمہیں اپنے راستے سے ہٹا کر شہر یار کو پالوں گی۔ شہر یار کا میری زندگی میں آنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ

کہ تم شہر یار کی ہم سب کی زندگیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جاؤ۔ ختم ہو جاؤ۔ تمہارے جانے سے شہر یار میری زندگی میں آ

جائے گا۔“ مشعل نے بہت بے حسی اور سفاکی سے کہا۔

”مشعل! میں امی ابو سے شہر یار اور تایا ابو سے سب سے بات کروں گی۔ وہ میری بجائے تمہیں شہر یار کی دلہن بنادیں۔“

سبل نے دکھ سے چور لہجے میں کہا۔

”تمہیں مجھ پر یہ احسان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام میں خود ہی کر لوں گی۔ بس تم نیچے چلی جاؤ اور وہاں کے مناظر فلم بند کرو۔ تمہاری موت کے بعد شہر یا خود بخود میری جانب مائل ہو جائے گا۔ بائے سبجل..... بائے فار ایور۔“ مشعل نے بہت سفاک لہجے میں کہتے ہوئے آگے قدم بڑھایا اور سبجل کو بہت صفائی اور تیزی سے نیچے دھکا دے دیا۔

سبجل جو اس حملے کے لیے قطعاً تیار نہ تھی۔ اپنے دفاع کے لیے کوئی اقدام نہ کر سکتی اور حیرت، دکھ اور بے بسی سے اپنے نیچے گرنے کا منظر دیکھتی ہوش و حواس کی دنیا سے بے نیاز ہو گئی۔ مشعل نے اس کے گرنے کے بعد خود کو ایک نئے ڈرامے کے لیے تیار کیا۔ چاروں جانب نگاہ دوڑائی جہاں دور دور تک کسی بندے بشر کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ریسٹ ہاؤس کی جانب چل دی۔ اور ”ریسٹ ہاؤس“ میں داخل ہوتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات خوف، دکھ اور رنج و الم کی تصویر پیش کرنے لگے۔ اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا جہاں سب لوگ گرم گرم چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

## قسط نمبر 2

”ابو، امی..... وہ۔“ اس نے انہیں دیکھتے ہی خوفزدہ اور بھگتے لہجے میں پکارا۔  
 ”مشعل! کیا ہوا تم اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“ ابو نے فکر مندی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”سجل کہاں ہے؟“ کنول بانو نے اس کے پیچھے نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا تو وہ رق گئی۔  
 ”کیا ہے ہے سجل کہاں ہے مشعل؟“ سب پریشان ہو گئے عمار بھائی نے اس سے پوچھا۔  
 ”وہ سجل۔ ابو۔ امی سجل گر گئی۔“  
 ”کہاں؟“

”پہاڑی سے۔ پاؤں پھسل گیا سجل نیچے گر گئی۔“ اسنے روتے ہوئے بتایا۔  
 ”کیا؟“ سب کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور سب اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔  
 ”ہائے میرے اللہ۔“ کنول بانو کے ہاتھوں سے چائے کا کپ پھسل کر نیچے جا گرا۔  
 ”کہاں گر گئی سجل کیسے گر گئی میری بچی؟“ اسرار رضا دوڑتے ہوئے باہر نکلے۔

”وہ۔ فلم بنارہی تھی۔ کیمرے سے میری بھی اور وادی کی۔ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ۔“ اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شہر یار کا تودل بند ہونے لگا تھا وہ تیزی سے مشعل کے سامنے آیا اور غصے سے پوچھنے لگا۔  
 ”کہاں گرا کر آئی ہو سجل کو بولو؟“

”مم۔ میں نے نہیں گرایا وہ۔ فلم بنارہی تھی اور پاؤں پھسل گیا۔“ مشعل نے بہت عمدہ اداکاری کرتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔

”چلو میرے ساتھ بتاؤں مجھے کس جگہ گری ہے سجل۔“ شہر یار اس کا بازو پکڑ کر سب کے سامنے اسے باہر لے گیا۔ کنول بانو کو ثمنینہ سنبھال رہی تھیں۔ عنبرین بھابھی شمرین بھابھی بھی اب سب کے ساتھ باہر سجل کو ڈھونڈنے چل دیں۔ برفباری تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہنستی بستی محفل پل بھر میں ماتم کدہ بن گئی تھی۔ مشعل نے جس جگہ سے سجل کو دھکا دیا تھا۔ اس کی بجائے دوسری جگہ کا انہیں بتایا تا کہ اتنی دیر میں سجل کی اگر کچھ سانسیں باقی بھی ہوں تو ختم ہو جائیں۔ سب اوپر سے نیچے تک برفباری اور تاریکی میں

ٹارچ اور لائٹیں لے کر سبل کو ڈھونڈتے رہے۔ وادی کے باشندوں نے بھی ان کو گائیڈ کیا۔ ان کے ساتھ سبل کو ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہ ملی تورات گئے وہ سب مایوسی اور دلگیر ہو کر واپس ریسٹ ہاؤس آ گئے۔ کنول بانو اور شمینہ کی حالت صدمے سے بگڑ رہی تھی۔ کنول بانو نے تو رو کر اپنی آنکھیں سو جھالیں تھیں۔ وہ سب کو ناکام لوٹتے دیکھ کر شدت سے روئیں۔ اسرار رضا بھی اپنا ضبط چھوڑ بیٹھے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ مشعل تو ان سے زیادہ بلک بلک کر رونے کی اداکاری کر رہی تھی۔ سبل کے نہ ملنے پر وہ خوش مطمئن تھی کہ اس کا وار خالی نہیں گیا اور شہر یار جو سب سے چھپ کر اشک بہا رہا تھا اس کے دل پر تو قیامت ٹوٹ گئی تھی۔ اس کی محبت اس کی متاعِ حیات لمحوں میں اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ خود کو خالی خالی اور بے روح محسوس کر رہا تھا۔

”میں نے کہا تھا ناکہ مت جائیں سیر کے لیے مگر آپ نے میری ایک نہیں سنی۔ دیکھ لیا نتیجہ۔ میری پھول جیسی بچی ان برف پوش اور سنگلاخ پہاڑوں میں نجانے کہاں گم ہو گئی ہے۔ ہائے میری سبل۔ میری لاڈلی کہاں چلی گئی تو۔ ابھی تو میں نے تجھے لہن بنے دیکھا تھا۔ ابھی تو تیرے ہاتھوں پہ مہندی سجانی تھی۔ ہائے میری بچی۔ میری گریارانی کہاں چلی گئی تو۔“ کنول بانو تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے دہائی دے رہی تھیں۔ ان کی حالت اور باتیں سب کو رلا رہی تھیں۔ سب کی سسکیاں اور ہچکیاں ”فاریسٹ ہاؤس“ کی چار دیواری میں گونج رہی تھیں۔ ہنسی کی جگہ آہیں گونج رہی تھیں۔

”قسمت میں شاید یہی لکھا تھا۔ ہماری سبل کی موت اسی وادی میں لکھی تھی اسی لیے تو وہ بار بار یہاں آنے کی ضد کر رہی تھی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ جہاں انسان کی موت لکھی ہو وہاں وہ خود بخود کھنچا چلا جاتا ہے۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں سوائے صبر کے۔“ اسرار رضا نے روتے ہوئے کہا۔

”چچا جان! سبل مل جائے گی وہ نہیں مر سکتی۔ آپ ابھی سے ہمت ہار بیٹھے۔ ہم اسے تلاش کریں گے۔“ شہر یار نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے پر نرم آواز میں کہا۔

”ہاں اسرار، حوصلہ کرو ہماری بیٹی ضرور ملے گی۔ وہ تو بہت بہادر بچی ہے۔“ ستار رضا نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا تو وہ روتے ہوئے بولے۔

”مگر بھائی جان۔ موسم کی بے رحمی کے آگے انسان کی بہادری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اس شدید برف باری میں تو وہ برف کے نیچے دب کر مر جائے گی۔“

”اللہ نہ کرے ہماری سبل کو کچھ ہو۔ ابھی اس نے دیکھا ہی کیا تھا۔ میرا دل کہتا ہے کہ سبل زندہ ہے۔“ شمینہ بیگم نے روتے ہوئے کہا۔ انہیں تو وہ بیٹی کی طرح عزیز تھی اور اب لاڈ لے بیٹے کی لہن بننے والی تھی۔ اس کی گمشدگی سے انہیں بھی بہت دھچکا لگا تھا۔

”کاش! میں تمہاری وجہ سے سبیل کو چھوڑ کر واپس ”ریسٹ ہاؤس“ نہ چلا آتا۔ اس کے ساتھ ہوتا تو اسے بچا لیتا۔“ شہریار نے مشعل کو دیکھتے ہوئے تاسف اور حسرت سے کہا۔

”کاش! میری جگہ تم ہی اس کے ساتھ چلے جاتے۔ وہ یوں نہ گرتی۔ ہائے میری بہن، پتا نہیں کس حال میں ہوگی۔“ مشعل نے ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے کہا۔ دل میں تو شہریار کی بات نے آگ لگا دی تھی۔ اداکاری خوب کر رہی تھی وہ رونے کی۔

”اب تو ٹھنڈ پڑ گئی نا تمہارے کلیجے میں۔ ہر وقت اس معصوم سے جلتی لڑتی رہتی تھی تم۔“ شہریار نے غصے سے صدمے سے چیخ کر کہا۔

”لڑائی جھگڑا تو سب بہنوں میں ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنی بہن کی موت پر..... خوشی مناؤں۔ تم بہت بے حس ہو شہریار۔ اگر وہ تمہاری محبت تھی تو..... میری بھی محبت کرنے والی بہن تھی۔ تم مجھے اس غم سے الگ سمجھتے ہو۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”پتا نہیں میں کیا سمجھتا ہوں مگر تم نے اس کے ساتھ جا کر میری زندگی برباد کر دی ہے۔ وہ اتنی لاپرواہ اور غیر محتاط نہیں تھی۔ ضرور تمہاری الٹی سیدھی باتوں نے اس کا دھیان بٹایا ہوگا۔“ شہریار نے بھگتے اور غصیلے لہجے میں کہا۔

”ہاں، میں ہی تصور وار ہوں۔ سزا دو مجھے۔ پھانسی پہ لٹکا دو مجھے۔“ وہ غصے سے روتے ہوئے چیخ کر بولی۔

”مشعل! آہستہ بولو۔ تم اب بھی جھگڑے سے باز نہیں آنا۔ میں نے اتنی مشکل سے امی کو نیند کی گولی دے کر سلا یا ہے۔“

عنبرین بھا بھی نے ان کے پاس آ کر سختی سے کہا۔

”بھابھی! ایک گولی زہر کی مجھے بھی کہیں سے لادیں تاکہ شہریار کے طعنوں سے میری جان چھوٹ جائے۔“ مشعل نے روتے ہوئے کہا۔

”کیا فضول بکواس کر رہی ہو۔ پہلے کیا کم صدمے سے دوچار ہیں ہم۔“

”بھابھی! میری بہن میرے سامنے لحوں میں..... نیچے جا گری۔ اور میں ڈکچہ نہ کر سکی۔ بھابھی، سبیل مل جائے گی نا۔ زندہ ہوگی نا وہ۔“ مشعل نے خوب رونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا تو عنبرین بھا بھی روتے ہوئے بولیں۔

”انشاء اللہ۔ اللہ اسے اپنی امان میں رکھے۔“

”آمین۔“ شہریار نے بھیکتی آواز میں کہا تو عنبرین بھا بھی نے اس سے کہا۔

”شیری! تم بھی سو جاؤ، صبح پھر سبیل کی تلاش میں نکلتا ہے۔“

”بھابھی! اگر سبجل نہ ملی تو میں کیسے جیوں گا۔“ وہ روتے ہوئے بولا۔

”تم میرے لیے، میرے سنگ جیو گے شہر یار رضا، جیسے ایک چاہنے والا مرد اپنی بیوی کے ساتھ جیتا ہے۔“ مشعل نے دل میں اسے مخاطب کر کے کہا۔

”تم کیا شیریں، ہم سب کیسے جنیں گے اس کے بغیر، اس کی جوان موت تو ہم سب کی خوشیوں کو مار دے گی۔“ عنبرین بھابھی نے روتے ہوئے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

”تم بھی جا کر سو جاؤ۔ تھک گئی ہوگی روتے روتے۔“ شہر یار نے مشعل کو دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا اور وہاں سے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

”ہونہہ۔ یہ ایک ٹنگ نجانے کتنے دن کرنا پڑے لیکن یہ طے ہے شہر یار رضا کہ تم اب میرے ہو۔ اب تمہیں کوئی سبجل مجھ سے نہیں چھین سکتی۔ تمہارے دل سے سبجل کو نکال کر میں اپنی تصویر سجادوں کی۔ تم پر اس طرح حاوی ہو جاؤں گی کہ تم سبجل کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ گے۔ اور ہر پل میری محبت کا دم بھرو گے۔ ہاں، بس چند مہینوں کی بات ہے پھر تمہاری زبان پر مشعل جلے گی میرے نام کی، تمہارے دل میں مشعل روشن ہوگی میرے پیار کی۔ اندر باہر سے مشعل ہی کے بن کے رہ جاؤ گے تم۔“ مشعل نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے دل میں مخاطب کر کے کہا اور سونے کے لیے چلی گئی۔

تین دن تک انہوں نے سبجل کو مقامی لوگوں اور انتظامیہ کی مدد سے سبجل کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر سبجل کا کوئی سراغ نہ ملا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ سبجل کی ڈیڈ باڈی برف میں کہیں دب گئی ہوگی۔ برف باری بھی شدید ہو رہی تھی۔ تلاش میں کامیابی کے امکانات بھی ختم ہو گئے تھے۔ شہر یار اور عمار بھائی کے سوا سب لوگ روتے پٹتے واپس کراچی چلے گئے تھے۔ عمار بھائی اور شہر یار سبجل کی تلاش کی غرض سے یہاں رک گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

فرجاد نے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد سورۃ فاتحہ اور آیت الکرسی پڑھ کر سبجل پر دم کیا۔ تو شیر خان نے چائے کا لگ میز پر رکھتے ہوئے ان سے کہا۔

”صاحب۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔“

”کیا مطلب؟“ فرجاد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بی بی لوگ اگر ادھر مر، مرا گیا تو۔“

”شٹ اپ۔ صبح صبح پھر منحوس باتیں شروع کر دیں تم نے جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔“ فرجاد نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا۔

”جاتا ہوں صاحب۔ ویسے صاحب۔ اس کا اور آپ کا جوڑی بہت سچے گا۔“  
 ”شیر خان۔“ فرجاد نے اسے غصے سے گھورا۔

”جاتا ہے صاحب۔“ وہ کھسیانی ہنسی ہنستا وہاں سے چلا گیا۔

”اسٹو پڈ۔“ فرجاد نے سر جھٹک کر کہا اور چائے کا گامگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ان کی نظریں ”سجل“ کے صبح چہرے پر مرکوز تھیں۔ انہیں یوں لگا جیسے اس کے ساکت وجود میں حرکت ہو رہی ہے۔ وہ چائے کا گامگ میز پر رکھ کر اس کے بیڈ کے قریب رکھے سٹول پر آ بیٹھے۔ سجل کے سر میں جنبش ہوئی آنکھوں کے بند کواڑ تھرتھرائے اور بے قراری سے دعا مانگتے فرجاد نے دیکھا کہ اس نے آہستہ آہستہ آنکھوں کے بند کواڑ پوری طرح سے کھول دیئے ہیں۔

”شکر الحمد للہ۔“ فرجاد کے لبوں سے بے اختیار کلمہ شکر ادا ہوا تو سجل نے آواز کی سمت دھیرے سے گردن گھما کر دیکھا ایک خوبصورت مرد کا چہرے جسے دیکھتے ہی اسے حیرت کا جھٹکا لگا وہ کہاں تھیں یہ شخص کون ہے جو اسے دیکھا دیکھا سا لگ رہا ہے؟  
 ”کیسا محسوس کر رہی ہیں اب آپ؟“ فرجاد نے بہت ملائمت سے پوچھا تو اس کے حواس یکلخت بیدار ہونے لگے اس نے حیران و پریشان ہو کر کمرے کی چھت کو دیکھا۔ دائیں بائیں جانب نظریں دوڑائیں۔ اسی وقت شیر خان کمرے میں داخل ہوا تو اسے ہوش میں دیکھ کر خوشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”مبارک ہو صاحب۔ اس بی بی لوگ کو ہوش آ گیا ہے۔“

”اب تم بھی ہوش سے کام لو ان کے لیے سوپ بنا کر لاؤ۔ تین دن بعد ہوش میں آئیں ہیں۔ انہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔“ فرجاد نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہے صاحب۔ ابھی بنا کر لاتا ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔

”یہ..... یہ کو..... ان ہے اور..... آ..... آپ کون ہیں۔ میں۔ میں..... کہاں..... ہوں؟“ سجل نے بہت کمزور اور رٹوتی آواز میں پوچھا۔

”آپ محفوظ جگہ پر ہیں آپ کو مجھ سے یا میرے ملازم شیر خان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں ہمیں اپنا خیال خواہ سمجھیں۔“ فرجاد نے نرمی سے کہا۔

”آپ۔ ٹائم ٹریکس کے..... ہیرو ہیں نا۔“ اس نے ان کی صورت دیکھتے ہوئے مدہم آواز میں کہا۔

”جی۔“ فرجاد نے آنکھیں سکیڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ وہ میں۔ مجھے یہاں کون لایا ہے؟“

”میں آپ کو یہاں لایا ہوں۔“

”کیوں..... مجھے..... کیا ہوا..... تھا؟“

”آپ کو چوٹ لگ گئی تھی۔“

”چوٹ۔“ اس نے اپنے سر پر بندھی پٹی پر ہاتھ رکھا اسے اپنے جسم میں غیر معمولی تھکن اور نقاہت کا احساس ہونے لگا۔

”آپ کو یاد ہے کہ آپ کو چوٹ کیسے لگی تھی؟“

”پانی..... پانی۔“ اس نے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”اوہ۔ سوری مجھے خیال ہی نہیں رہا میں نے آپ کے ہوش میں آتے ہی انکوائری شروع کر دی۔ لیس پانی پیئیں۔“ فرجاد نے نام ہو کر کہا اور قریب رکھے پانی کے گلاس میں سے چمچ بھر کر اس کے منہ میں پانی ڈالا اس نے تین چار گھونٹ پانی پیا اور پھر

تک کر آنکھیں موند لیں۔ فرجاد نے اب کے اسے پکارا نہیں بس اس کے چہرے کو تکتے رہے جو بالکل سفید ہو رہا تھا۔ سب کو یاد آ رہا تھا کہ وہ مشعل کے ساتھ ”ریسٹ ہاؤس“ سے باہر فلم بنانے کے لیے نکلے تھے۔ وہ مشعل کی اور وادی کے دلکش مناظر کی فلم بنا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں سارا منظر گھومنے لگا۔

”اور میرا مستقبل بن جائے گا۔ تمہارے جانے سے شہر یار میری زندگی میں آ جائے گا۔ تمہاری موت کے بعد شہر یار

خود بخود میرے جانب مائل ہو جائے گا۔ بائے سبیل بائے فار ایور۔“ مشعل کے الفاظ اور اپنے گرنے کا منظر اسے یاد آیا تو وہ خوف سے چیخ اٹھی۔ اور ساتھ ہی آنکھیں بھی کھول دیں۔ فرجاد نے پریشانی سے اس کے چہرے کو دیکھا اور ماس کے قریب بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”کیا ہوا آپ خواب میں ڈر گئیں کیا؟“

”خواب..... نن..... نہیں تو..... وہ خوا..... ب تو نہیں تھا..... وہ تو..... سچ..... سچ تھا..... اس نے..... مجھے پہاڑی

سے نیچے..... گرادیا..... اور خود کو میری..... نظروں سے۔“ سبیل نے بہت مدھم اور دلگیر لہجے میں کہا۔ فرجاد نے بہت توجہ سے اس کی آواز اور الفاظ کو سنا جس سے انہیں اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ خود نہیں گری کسی نے جان بوجھ کر اسے گرایا ہے۔ مگر انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی حسین اور معصوم صورت لڑکی کون بے حس انسان موت کی وادی میں دھکیل سکتا ہے؟

”مجھے امی ابو کے پاس..... جانا ہے..... وہ..... پریشان ہو رہے ہوں..... گے۔“

”اگر وہ لوگ آپ کے ساتھ آئے تو اب تک تو وہ آپ کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس چلے گئے ہوں گے کیونکہ آپ آج

چوتھے دن کی صبح کو ہوش میں آئی ہیں۔“



”اوہ۔“ اس نے بے بسی اور دکھ سے سر ہلایا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ تندرست ہو جائیں پھر میں خود آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آؤں گا۔“ فرجاد نے اٹھ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب میں گھر..... جا کے کیا کروں گی۔ اب تک تو وہ لوگ..... میری فاتحہ بھی..... پڑھ چکے ہوں اور..... آ..... اوہ۔“ وہ بولتے بولتے اٹھ کر بیٹھنے لگی تو اس کی بائیں پسلی میں درد کی شدید لہر اٹھی اور وہ تکلیف کے احساس سے بلبلا اٹھی۔

”کیا ہوں سبج۔ کیا درد محسوس ہو رہا ہے آپ کو؟“ فرجاد نے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر پوچھا۔

”ہاں۔ بہت درد ہے۔ میری پسلی میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ وہ تکلیف سے رونے کو ہو گئی۔

”اچھا میں آپ کو دوا پلا دیتا ہوں اگر خدا نخواستہ فریکچر ہے تو سو جن اور درد برقرار رہے گا۔ ورنہ اس دوا سے آپ کو دو چار

دن میں یقیناً آرام آ جائے گا۔ لیکن پہلے آپ سو پ پی لیں۔ تین دن سے آپ بھوک پیاسی ہیں..... شیر خان، شیر خان سوپ لے آؤ یار۔“ فرجاد نے اسے نرمی سے کہا اور پھر کھڑے ہو کر شیر خان کو آواز دی۔ سبج نے اپنے پاؤں میں بھی درد محسوس کیا بائیں پاؤں کو بیٹھنے کے لیے پیچھے کیا تو خود بخود اس کے لمبوں سے ہلکی سے چیخ نکل گئی۔

”میرا پاؤں بھی درد کر رہا ہے۔“ وہ رو دی۔

”اونو۔ دراصل آپ اس رخ پر اوپر سے نیچے گریں تھیں۔ شاید اسی لیے آپ کے جسم کے اس حصے میں درد ہو رہا ہے۔

میں چیک کر لیتا ہوں شاید موج ہی آئی ہو۔“ فرجاد نے بے کلی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا پھر اس کے پیچھے تکیہ لگا کر اسے آرام سے بٹھایا اور اس کے پاؤں کو پکڑ کر دیکھنے لگے۔ کتنا ملائم پاؤں تھا اس کا سفید اور ملائم انہوں نے اس کے پاؤں کو اوپر سے دبایا تو وہ کراہ اٹھی۔

”میرا خیال ہے کہ پاؤں کی رگ چڑھ گئی ہے۔ مساج کرنے سے اور دوا پینے سے آرام آ جائے گا۔ ایک تو موسم خراب

ہونے کی وجہ سے ہم آپ کو باہر کسی ہسپتال میں یا کلینک میں بھی نہیں لے جاسکتے۔ برفباری کی وجہ سے راستے بھی بند ہیں اور

ہسپتال یہاں جو ہو گا وہ بھی بند ہو گا۔“ فرجاد نے اپنے میڈیکل بکس میں سے آیوڈیکس کی ڈبیہ نکالی اور اس کے پاؤں پر مساج

کرتے ہوئے بولے۔ سبج ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اسے وہ انگلش فلم ”ٹائم ٹریکس“ کے ہیرو لگ رہے تھے اتنا اسمارٹ،

چارمنگ اور ڈیشنگ شخص کتنی اپنائیت اور کتنے خلوص کے ساتھ اس کے زخموں پر مرہم لگا رہا تھا۔ اس کے پاؤں پر مساج کر رہا تھا۔

اسے ایک دم سے فرحت اور تازگی کا احساس ہونے لگا۔

”بس کریں مساج۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“ اس نے آہستگی سے کہا تو ان کے ہاتھ رک گئے۔

”کیا درد ہو رہا ہے؟“ فرجاد نے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”نہیں مگر۔ میں نے یوں کبھی کسی سے۔ اپنی خدمت نہیں کرائی۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”پھر تو یہ میری خوش بختی ہے کہ مجھے آپ کی خدمت کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔“ فرجاد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھ گئی۔

”سوپ آگیا ہے بی بی صاحب۔“ شیر خان کی آمد اور آواز پر وہ دونوں چونک گئے۔

”رکھ دو ادھر اور بی بی کی جرابیں دھو دیں تھیں تم نے۔“ فرجاد نے اٹھ کر کہا۔

”جی صاحب۔ یہ رکھی ہیں جرابیں۔“ اس نے الماری کی دراز میں سے سب کی جرابیں نکال کر انہیں دے دیں۔

”یہ آپ پہن لیں تاکہ پاؤں گرم رہیں۔“ فرجاد نے جرابیں سب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو اس نے خاموشی سے جرابیں ان کے ہاتھ سے لیں اور پہننے لگی۔

”یہ واش رہم ہے اگر آپ جانا چاہیں تو لیکن احتیاط سے۔“ فرجاد نے کمرے سے ملحق واش روم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا تو اس نے سر ہلادیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے تو وہ ہمت کر کے آہستہ سے بستر سے نیچے اتر آئی اور آہستہ

آہستہ چلتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔ وہاں سے فارغ ہو کر آئی تو اس کا دل چاہا کہ باہر کا منظر دیکھے پاؤں اور پسلی میں چلنے سے بھی ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ مگر اس نے کھڑکی تک پہنچنے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ کھڑکی تک پہنچ کر ابھی کھڑکی کھولنے کے لیے

ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ فرجاد کمرے میں داخل ہوئے اور اسے دیکھتے ہی بولے۔

”ارے یہ کیا کر رہی ہیں آپ کھڑکی مت کھولیں۔“

”میں باہر دیکھنا چاہتی ہوں۔“ اس نے ان کی جانب رخ پھیر کر کہا۔

”فی الحال تو آپ اندر ہی دیکھیں کیونکہ باہر سوائے برف کے کچھ نہیں ہے۔“

”ہائے اللہ جی۔“ وہ واپس آنے لگی تو پاؤں کی تکلف سے لڑکھڑا گئی۔

”بہت شوق ہے آپ کو گرنے کا۔ ہوں۔“ فرجاد نے تیزی سے لپک کر اسے تھام لیا۔

”شوق سے کون گرتا ہے مسیحا۔“

”مسیحا۔“ وہ اس طرزِ مخاطب پر خوشی سے مسکرائے۔

”زخموں پر مرہم رکھنے والے اور مسیحائی کرنے والے کو مسیحا ہی کہتے ہیں ناں۔“

”ہاں لیکن آپ مجھے میرے نام سے بھی پکار سکتی ہیں۔ مائی گڈنیم از فرجاد حسین۔“

”فرجاد۔ کتنا پیرا اور منفرد نام ہے۔ میں نے پہلی بار سنا ہے یہ نام۔“

”شکریہ۔ چلے آئیے سوپ پی لیس ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کا بازو پکڑے اسے بیڈ تک لے آئے۔ اور سوپ کا پیالہ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ سوپ پیتے پیتے جانے کن سوچوں میں کھو گئی۔

”بجل۔“ فرجاد نے اسے پکارا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”آپ اس نام کو سن کر چونک گئی ہیں اس کا مطلب ہے کہ سر کی چوٹ کے باعث آپ کی یادداشت متاثر نہیں ہوئی۔“

”ہو جاتی تو اچھا تھا۔“ وہ سوپ کا پیالہ ہاتھوں کے پیالے میں لیے نظریں جھکا کر بولی۔

”ایسے نہیں کہتے بجل۔ زندگی تو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے نئی زندگی عطا کی ہے۔“ فرجاد نے اسے بہت نرمی سے سمجھایا۔

”آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے انہیں دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کے گلے میں جو لاکٹ ہے اس پر آپ کا نام کندہ ہے بہت پیارا نام ہے آپ کی شخصیت کی طرح۔“ فرجاد نے اس کے صبح چہرے کو دیکھتے ہوئے بتایا تو وہ سوپ کا پیالہ سائیں ٹیبل پر رکھ کر اپنے گلے میں پہنا لاکٹ نکال کر دیکھنے لگی۔

”لاکٹ دینے والا یاد آ رہا ہے۔“ فرجاد نے کہا۔

”ہاں۔“ اس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ فرجاد کے اندر بے کلی سی پھیلنے لگی تھی۔

”کون تھا وہ؟“ یہ جاننے کی بے تابی عروج پر تھی۔

”تھا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ سلامت رکھے۔ یہ لاکٹ مجھے میری بھابی نے ابھی چند روز پہلے گفٹ کیا تھا۔ حالانکہ میری ساگرہ میں ابھی دو ماہ باقی ہیں۔ انہوں نے پہلے ہی ساگرہ کا تحفہ دے دیا مجھے..... شاید انہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ یہ حادثہ ہونے والا ہے۔“ اس نے بھیکتی آواز میں بتایا تو فرجاد کو جہاں ایک اطمینان سا ہوا وہاں اس کی آنکھوں کے آنسو اور لہجے کا دکھ انہیں تڑپا بھی گیا۔

”کیا ہوا تھا بجل، تمہارے لباس کی احتیاط سے تو ظاہر ہے کہ تم خود کشی یقیناً نہیں کر سکتیں۔“

”آپ کا خیال درست ہے مسیحا۔ میں اتنی کمزور اور بزدل نہیں ہوں کہ حالات سے گھبرا کر فرار کی راہ اختیار کرنے کا سوچوں۔ اور پھر۔ میرے حالات تو قطعاً ایسے نہ تھے کہ میں۔ ایسا سوچتی۔“ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر پریم لہجے میں بولی۔

”پھر یہ سب کیسے ہو گیا؟“

”کبھی کبھی انسان بے خبری میں بھی تو مارا جاتا ہے نا۔ جنہیں وہ اپنا سمجھتا ہے جن سے اسے کسی منفی بات یا رویے کی..... توقع نہیں ہوتی کبھی کبھی وہی لوگ وہی اپنے اس کی..... جان کے درپے ہو جاتے ہیں۔“ اس نے پریم لہجے اور بھیکتی آنکھوں سے کہا۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ تم خود نہیں گریں فوٹو گرافی یا مووی میکنگ کرتے ہوئے بھی خود نہیں گریں تھیں۔ کسی نے گرایا ہے جان بوجھ کر گرایا ہے۔ ہے نا۔“ فرجاد نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں محترم مسیحا۔ مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چھکے۔“ وہ زخمی مسکراہٹ لیوں پر سجا کر بولی آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر بہہ نکلے۔

”پلیز روئیں نہیں۔ حوصلہ رکھیں انشا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیں دوا پی لیں۔“ فرجاد نے پانی میں چند قطرے دوا کے ڈال کر اسے گلاس دیتے ہوئے کہا۔

”شکریہ مسیحا۔“ اس نے دوا پی کر انہیں گلاس واپس کرتے ہوئے کہا۔

”ویسے اچھا ہے یہ طرزِ مخاطب بھی مسیحا۔ تم اب لیٹ جاؤ باقی باتیں پھر کریں گے۔ میں تمہیں تم کہہ رہا ہوں تمہیں برا تو نہیں لگ رہا۔“ انہوں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں آپ مجھ سے بڑے ہیں۔“ مجھے تم“ کہہ سکتے ہیں۔“ اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”تھینکس۔ چلو اب لیٹ جاؤ۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے لینا۔ ہم پر اعتبار کرنا۔ تم بالکل اپنے گھر کی طرح رہو،

ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ فرجاد نے اس کے لیٹنے پر کمر اس پر پھیلاتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔

”جی بہتر، سنیں میرا ایک بیگ تھا وہ تو آپ کو نہیں ملا۔“ اس نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے لیٹے لیٹے پوچھا تو انہوں نے

مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ملا ہے آپ کا بیگ اور کیمرو الماری میں رکھا ہے۔ لا دوں۔“

”نہیں شکریہ۔ میں پھر دیکھوں گی۔“

”اوکے۔ ایز یوش۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

”کتنے اچھے انسان ہیں فرجاد حسین۔ جو غیر ہو کر میرے زخموں پر مرہم رکھ رہے ہیں۔ اور میری بہن نے مجھے یہ زخم

لگائے ہیں۔ اپنوں اور غیروں میں کیسا انوکھا تضاد ہے۔ معاملہ کتنا الٹ ہے۔ غیر اپنے بنے ہیں اور اپنے غیر۔ پتا نہیں امی ابو، عمار

بھائی، عنبر بھائی اور شہر یار بھائی کا کیا حال ہوگا۔ وہ لوگ تو مجھے مردہ سمجھ کر برف میں دفن سمجھ کر چھوڑ کر چلے بھی گئے ہو گے۔ تایا ابو،

تائی امی، ذوالفقار بھائی، ثمرین بھائی سب کتنے دکھی ہوں گے۔ اور مشعل..... مشعل تو بہت خوش ہوگی۔ مجھے اپنے راستے سے ہٹا

کر۔ نجانے اس نے واپس جا کر ان سب کو کیا بتایا ہوگا۔ شاید یہ کہ میں پاؤں پھسل کر نیچے جا گری ہوں۔ آہا۔“ سب نے دل

میں سوچا اور بھیکتی آنکھوں کے در بند کر لیے۔

دو گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کپڑے تبدیل کرنے کے خیال سے فوراً اٹھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اس کی پسلی میں شدید درد اٹھا اور وہ بہت زور سے کراہ اٹھی۔ فرجاد جو قریب ہی کرسی پر بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

”سجل بی بی، آرام سے۔ مجھے بتائیے کچھ چاہیے آپ کو۔“ فرجاد نے کتاب بند کرتے ہوئے نرمی سے کہا تو وہ ان کی طرف بے بسی اور معصومیت سے دیکھنے لگی۔ فرجاد کا دل اس کی حالت پر ڈانواں ڈول ہو گیا۔ انہیں اپنی کیفیت کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ عجب بے قراری اور اضطراب کی سی حالت تھی۔ انہوں نے خود کو بے بس محسوس کرتے ہوئے نومی سے کہا۔

”سجل پلیز۔ ہمت سے کام لیں۔ بتائیں کیا چاہیے آپ کو۔“

”میں چیخ کرنا چاہتی ہوں۔ میرا بیگ لادیں پلیز۔ اس میں میرے کپڑے ہوں گے۔“ اس نے پر غم آواز میں کہا۔

”اوکے میں ابھی لادیتا ہوں۔“ فرجاد نے کتاب میز پر رکھی اور الماری سے اس کا سفری بیگ نکال لائے۔

”لیجئے اپنا بیگ۔“ فرجاد نے بیگ اس کے سامنے رکھ دیا۔

”تھینک یو۔“ سجل نے آہستگی سے کہا اور بیگ کی زپ کھول کر اس میں سے چیزیں نکالنے لگی۔ مووی کیمرہ، اسٹل فوٹو

گرانی کا کیمرہ، واک مین، ڈائری پین ہسٹ اور چپس کے پیکٹ، خشک میوے، رومال، کافی کا پیکٹ، مفلر، اپنا چاکلیٹی کلر کا گرم سوٹ نکالا تو سارا بستر چیزوں سے بھر گیا۔

”اومائی گاڈ! یہ آپ کا ٹریول بیگ ہے یا عمر و عیار کی زنبیل۔“ فرجاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”عمر و عیار کی نہیں سجل اسرار کی زنبیل۔“ سجل نے ذرا سا مسکرا کر جواب دیا تو وہ ہنس پڑے۔ ان کی ہنسی نے سجل کے دل

کے تاروں کو چھولیا۔ اس نے بہت حیرت سے ان کا چہرہ دیکھا۔

”کسی مرد کی ہنسی اتنی دلنشین بھی ہو سکتی ہے۔ دل کو چھو جانے والی۔ دل کو گدگدانے والی۔“ سجل انہیں دیکھتے ہوئے

حیرانگی سے سوچ رہی تھی۔

”آپ کے والد کا نام اسرار ہے؟“ فرجاد نے پوچھا تو وہ چونک سی گئی۔

”ہوں، ہاں۔ اسرار رضا ہے میرے ابو کا نام۔“

”اچھا آپ چیخ کر لیں اور پلیز باتھ نہیں لیں گی آپ۔ سردی کی چوٹ ہے بہت دنوں تک تکلیف دے گی پھر۔“

انہوں نے اسے چلتے چلتے ہدایت دی۔

”ہمارے علاقے میں تو گرمی ہی رہتی ہے۔ سارا سال اور یہاں برف پڑی رہی ہے۔ قدرت نے سارے موسم

ہمارے ملک کو عطا کیے ہیں۔ اور ہم کتنے ناشکرے لوگ ہیں۔ پستہ کھائیں گے۔“ سجل نے سنجیدہ اور نرم لہجے میں کہتے ہوئے ایک

دم سے پستے کا لفافہ ان کی جانب بڑھا دیا تو وہ اس کی اس معصوم سی پیش کش پر مسکرا دیئے۔

”ضرور کھائیں گے۔ آپ اتنے خلوص سے آفر کریں تو ہم انکار کیسے کر سکتے ہیں۔“ فرجاد نے مسکراتے ہوئے کہا اور لفافے میں ہاتھ ڈال کر تھوڑے سے نمکین پستے نکال لیے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”آپ چیخ کر لیں پھر اکٹھے لنچ کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا تو وہ کمرے سے باہر چلے گئے اور جاتے ہوئے دروازہ بند کر گئے۔ سب ل اپنے کپڑے لے کر دیوار کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی واش روم میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر کڑے تبدیل کر کے باہر آئی۔ اور بیگ میں سے کنکھی نکال کر پٹی سے آزاد بالوں کو بہت آہستگی اور نرمی سے سلجھایا۔ باندھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تھکن سے نڈھال ہو کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھے بیٹھے ہی بیڈ کی بیگ سے سر نکا دیا۔ اسے مشعل کی باتیں اور اس کا اسے جان سے مارنے کا اقدام یاد آنے لگا اور سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ فرجاد کمرے میں داخل ہوئے تو اسے یوں بیٹھا دیکھ کر پھر سے بے قرار ہونے لگے۔

میں تجھے جانتا نہیں پھر بھی

دل میں یہ اضطراب کیسا ہے

انہوں نے دیکھا، چاکلیٹی رنگ کے سادہ سے شرٹ اور ٹراؤزر میں زخموں سے چور یہ غزدہ لڑکی اپنی تمام تر سادگی میں بھی حسن کی دیوی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر دلکشی اور معصومیت رقصاں تھی۔ جو کسی بھی مضبوط دل اور اعصاب کے مالک شخص کو موم کر سکتی تھی۔ اتنا حسن، اتنی معصومیت اور پاکیزگی انہوں نے پہلی بار ایک ہی پیکر میں یکجان دیکھی تھی۔ انہیں اپنی نگاہوں کی بے باکی پر غصہ آنے لگا۔ بمشکل نگاہیں سب ل کے چہرے سے ہٹائیں اور شیر خان کو آواز دے کر بولے۔

”شیر خان! کھانا لے آؤ یا۔“

سب ل ان کی آواز پر فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور دوپٹے شانوں پر پھیلائے لگی۔

”آپ نے جرسی نہیں پہنی؟“ فرجاد نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے نہیں پہنی جا رہی۔“ اس نے تھکے تھکے لہجے میں صاف گوئی سے جواب دیا۔

”اور میں آپ کو پہنا نہیں سکتا۔“ فرجاد نے مسکرا کر شوخ لہجے میں کہا تو وہ بوکھلا گئی اور اپنی گرم شمال اٹھا کر اپنے گرد پھیلا لی۔

”لیس صاب۔ گرما گرم کھانا تیار ہے۔“ شیر خان ٹرے اٹھائے اندر چلا آیا۔

”ہوں۔ خوشبو تو بہت عمدہ آرہی ہے۔“ فرجاد نے گہرا سانس لے کر خوشبو اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔

”کھانا بھی بہت عمدہ ہے صاب۔“

”شیر خان اور میاں مٹھوکی سی باتیں۔“ سبیل نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور وہ دونوں ہنس پڑے۔

”بی بی! آپ کھا کر دیکھو پھر بتانا، ابھی میں جاتی ہے وہ میں نے اپنی بلبل کے واسطے بھی بنایا ہے اسے پلانا ہے۔“

شیر خان نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بلبل کو بیچنی پلاؤ گے؟“ سبیل نے حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں بی بی صاب۔ بلبل ہماری گھر والی کا نام ہے۔“ وہ شرماتے ہوئے بولا۔

”اچھا، تمہاری بیوی کا نام بلبل ہے۔ تمہارا نام شیر خان ہے۔ بچے ہیں تمہارے؟“

”بچے بھی ہو جائیں گے کچھ دنوں تک۔“ وہ شرمائے گیا۔

”ہوں، تو ایسا کرنا کہ تم اپنے بیٹے کا نام چیتا رکھنا اور بیٹی کا نام چڑیا رکھ لینا۔ اور گھر کے باہر بورڈ لگا دینا۔“ چڑیا گھر۔“

ٹھیک ہے۔“ سبیل نے مسکراتے ہوئے بہت سنجیدگی سے مشورہ دیا تو فرجاد ہنسنے لگے۔

”بی بی صاب! آپ بھی کمال بات کرتا ہے ویسے ہم تو آپ کا اور صاب کا نام اپنی بیٹا بیٹی کو دے گا ہاں۔ ابھی ہم

جائے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”ہاں جاؤ۔“ سبیل نے مسکرا کر کہا تو وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

”آئیے بسم اللہ کیجئے۔“ فرجاد نے کھانے کی میز اس کے قریب سرکاتے ہوئے کہا اور خود بھی کرسی قریب کھسکا کر بیٹھ

گئے۔ اور دونوں نے بہت خاموشی سے کھانا کھایا۔

آج اسے یہاں آئے اور کٹیج میں ٹھہرے ہوئے پورے دس دن ہو گئے تھے۔ اس کی پسلی اور پاؤں کی تکلیف فرجاد کی

دی ہوئی دوا پینے سے ختم ہو گئی تھی۔ سر کا زخم بھی کافی حد تک مندمل ہو گیا تھا۔ فرجاد نے باقاعدگی سے اس کی پٹی بدلی تھی۔ اس روز

کے بعد فرجاد نے اس سے پوچھا نہیں تھا کہ اسے کس نے دھک دیا تھا اونچائی سے اور نہ ہی سبیل نے انہیں کچھ بتایا تھا۔ وہ خود یاد کرتی

تو اس کا سر درد سے پھٹنے لگتا۔ رات کو سوتی تو نیند میں وہی اپنے گرائے جانے کا منظر اور مشعل کی شکل خطرناک عزائم کا اظہار کرتی

اسے خواب میں نظر آ کر ڈرانے لگتی اور وہ خوفزدہ ہو کر گھبرا جاتی۔

آج بھی یہی ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر خوفزدہ ہو کر جاگ گئی۔ اٹھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے گلاس سے پانی پیا۔ اپنی ریٹ وائچ اٹھا

کر ٹائم دیکھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ ساڑھے نو بجے سونے کے لیے لیٹی تھی اور نیند آتے ہی خواب میں ڈر کر جاگ اٹھی

تھی۔ سامنے والے کمرے میں فرجاد سوتے تھے۔ اس کمرے کی لائٹ جلی دیکھ کر وہ بستر سے نکل آئی۔ شال اپنے گرد پھیلا کر

کمرے کے دروازے کو پیچھے دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو فرجاد کو بیڈ پر نیم دراز محو مطالعہ پایا۔ وہ چند ثانیے انہیں دیکھتی رہی۔ اسے



ان سے بہت عقیدت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں فرجاد کے لیے بے حد عزت اور احترام تھا۔ جس طرح انہوں نے اس کا خیال رکھا تھا، اس کی تیمارداری کی تھی وہ تو ان کی مقروض و ممنون ہو گئی تھی۔ چھوٹ دوانچ قد۔ دلکش نین نقش کے مالک، سیاہ چمکتے بالوں، گہری نیلی روشن آنکھوں اور سرخ و سفید رنگت رکھنے والے فرجاد حسین مردانہ وجاہت کا بھرپور پیکر تھے۔ ان کا مضبوط جسم، مسکراتے ہونٹ، دل کو لگدگانے اور چھو جانے والی دلفریب ہنسی، دھیمالہجہ، نرم اور فرحت آگیاں لہجہ سب کو بری طرح متاثر کر گیا تھا۔ اسے ان کے پاس تحفظ اور اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔

سبیل نے اپنے خیال اور نگاہ کو جھٹک کر دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو فرجاد نے فوراً کتاب سے نگاہ اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا تو سبیل کو ایک چار پانچ سال کی ڈری سہمی اور معصوم بچی کی مانند دروازے کے ساتھ کھڑے دیکھ کر ان کا دل بے اختیار اس کی جانب ہمکنے لگا۔ کیسی کشش تھی اس کے پیکر جمال میں۔

”سبیل! دروازے میں کیوں کھڑی ہیں۔ اندر آجائیے۔“ انہوں نے خود کو قابو میں کرتے ہوئے نرمی اور اپنائیت سے کہا تو اسی طرح ڈرتے ڈرتے اندر آ گئی۔ فرجاد کتاب ایک طرف رکھ کر بستر سے اتر آئے۔

”کیا بات ہے، پھر آنکھ کھل گئی؟“ انہوں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے جب بے بسی اور آزر دگی سے سر ہلایا، فرجاد کا دل تڑپ کر رہ گیا۔

”اچھا آؤ، یہاں بیٹھو جہاں تم ایزی فیمل کرو وہاں بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے اپنی گرم شال اپنے شانوں پر پھیلاتے ہوئے بہت پیار سے کہا تو وہ ہیٹر کے قریب نیچے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ فرجاد بھی اس کے سامنے آ بیٹھے۔

”پھر کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔“ فرجاد نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بعض حقیقتیں اتنی تلخ ہوتی ہیں کہ خوابوں میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ نیند میں بھی ہراساں کیے رکھتی ہیں۔“ انہوں نے سنجیدہ اور کر بناک لہجے میں جواب دیا۔

”لیکن کسی اپنے سے ہمدرد انسان سے بھی اپنی پریشانی، اپنا دکھ شیئر کرنے سے ایک تحفظ کا سا احساس ہوتا ہے۔ اپنے اکیلے ہونے کا خوف یا دکھ نہیں رہتا۔ کیا تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتیں کہ اپنا دکھ مجھ سے شیئر کر سکو۔“ فرجاد نے نرم اور دھیمے لہجے میں کہا۔

”آپ سے۔“ وہ انہیں دیکھنے لگی اور اس کا یوں دیکھنا ان کے دل پر قیامت ڈھا گیا۔ دل کی یہ حالت اس سے پہلے تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ جب سے وہ انہیں ملی تھی دل کے دھڑکنے کے انداز ہی بدلتے جا رہے تھے۔ احساس کے جذبے ہی انوکھے ہو رہے تھے۔



ایسے مت دیکھو سبجل۔ مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ دل کا بے قابو، بے بس اور بے اختیار ہونا کسے کہتے ہیں۔ مجھے ضبط کی ان منزلوں سے گزرنے کا اس سے پہلے ایسا حسین تجربہ نہیں ہوا۔“ فرجاد نے بمشکل اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور ہیٹر کی سرخ جالی سے نکلتی گرماہٹ کو محسوس کرتے ہوئے بولے۔

”آپ بہت اچھے ہیں مسیحا۔“ سبجل نے دل سے کہا۔

”تو کیا تم اس اچھے مسیحا سے اپنا دکھ شیر نہیں کرو گی؟“ فرجاد نے اس کا چہرہ دیکھا۔

”میں نے تو ہمیشہ دوسروں سے خوشیاں شیر کی ہیں۔ آپ دیکھ شیر کرنے کو کہہ رہے ہیں۔ کیا بتاؤں میں آپ کو کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں تو خود اب تک شاک کی سی کیفیت میں ہوں۔ یقین اور بے یقینی کی دھند میں لپٹی کھڑی ہوں۔ کیا بتاؤں مسیحا؟“ اس نے انہیں دیکھتے ہوئے آزر دگی سے کہا۔

”تمہیں پہاڑی سے کسی نے جان بوجھ کر گرایا تھا؟“ فرجاد نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”کس نے؟“ فرجاد نے بے تابی سے پوچھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے مشعل کا چہرہ آگیا۔

”بتاؤ سبجل، کس بے حس اور سفاک شخص نے تمہیں گرایا تھا؟“

”میری..... بہن نے۔“

”کیا؟ بہن نے؟“ فرجاد کی حیرت اپنے عروج پر تھی۔

”جی۔“

”سگی بہن نے؟“ فرجاد نے بے یقینی حیرت اور دکھ سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ آنسو پلکوں کی سرحد عبور کرنے لگے۔

”مگر کیوں؟“ فرجاد نے حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے روتے ہوئے ساری بات، ساری حقیقت انہیں بتادی۔

”اومائی گاڈ۔ اتنی بے حسی، اس قدر خود غرضی اور سفاکی محبت کے لیے۔ بہت دکھ ہوا ہے مجھے یہ سب جان کر۔ تم پلیز خود کو سنبھالو۔“ فرجاد نے دکھ اور تاسف سے کہا۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور فرجاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح چپ کرائیں۔ کیسے تسلی دیں، کیسے اس کی ہمت بندھائیں۔ وہ بے قراری اور پریشانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اتنے دن سے جو آنسوؤں کا سیلاب اس کے اندر رکھا ہوا تھا اب ان کے پوچھنے پر اپنائیت پر سارے بند توڑتا ہوا بہہ نکلا تھا۔ فرجاد کو احساس تھا کہ

اس نے اب تک خود پر کتنا جبر کیا ہے، کتنا روکے رکھا تھا اب تک ان اشکوں کو اس لیے وہ چاہتے تھے کہ وہ کھل کر رو لے تاکہ اس کا جی ہلکا ہو جائے۔

”پڑھتے اور سنتے ہی آئے تھے اب تک کہ دولت، عورت اور محبت کے لیے لوگ خون کے رشتوں کو ختم..... کر دیتے ہیں۔ مگر..... مجھے نہیں پتا تھا کہ..... میں بھی اس تجربے سے کبھی گزر سکتی ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی مسیحا اس نے.....“ وہ بولتے بولتے آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

فرجاد کی آنکھیں اس کے غم پر اس کی حالت پر غم ہونے لگیں۔ انہوں نے اپنا مضبوط اور توانا دست جمیل اس کے سر پر رکھ دیا اور سب کو رونے کے لیے ایک کندھا چاہیے تھا۔ بے اختیار ان کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرجاد اس کے رونے کے ساتھ ساتھ اب اس کے لمس سے بھی بوکھلا گئے تھے۔ وہ اس کے کانپتے، لرزتے وجود کو اس کی سسکیوں، ہچکیوں کو دیکھتے محسوس کرتے اور دکھی ہوتے رہے۔ جب وہ رو چکی تو انہوں نے اس کا سر تھپک کر اس کی شال سے اس کا چہرہ صاف کر دیا اور اسے پانی لا کر پلایا۔ اس کے آنسو ختم گئے تھے مگر وہ بچوں کی طرح ہچکیاں لے رہی تھی۔ اتنا تو وہ کبھی بھی نہیں روئی تھی۔ جتنا آج روئی تھی۔ اپنی سگی بہن کے دیے ہوئے گھاؤ سے بلبلایا کر روئی تھی۔

”سجل! کیا تمہیں شہریا سے محبت نہیں ہے؟“ فرجاد نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔  
”مجھے تو شہریا رسمیت سب سے محبت تھی، ہے۔ مگر وہ محبت جو مشعل کو شہریا بھائی سے ہے، مجھے ویسی محبت نہیں تھی ان سے۔ میں انہیں ہمیشہ اپنا دوست اور بھائی ہی سمجھا تھا۔ اس حادثے سے پہلے شہریا بھائی نے..... مشعل کے سامنے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا تو فرجاد بے کل ہو گئے۔

”یہ تو بہت خوشی کی بات ہے کہ تمہارا ہونے والا شوہر تم سے محبت کرتا ہے۔ تم اس سے رابطہ نہیں کرو گی۔ وہ تمہارے زندہ ہونے کی خبر پا کر پھر سے زندہ ہو جائے گا۔“

”نہیں مسیحا، ان کی محبت کی میں قدر کرتی ہوں لیکن.....“  
”لیکن کیا؟“ فرجاد کے اندر ایک بے کل سی ہلچل مچ گئی تھی۔ وہ کسی اور کی محبت تھی۔ منگنی شدہ تھی۔ سب کی پسند سے اس کی منگنی اور شادی کی تاریخ ہوئی تھی۔ یہ حقائق انہیں بے قرار اور بے چین کر رہے تھے۔ انہیں اپنی حالت پر حیرت ہو رہی تھی۔

”مجھے ایسی محبت نہیں چاہیے جسے پانے کے لیے میری بہن نے میرا قتل کرنا چاہا۔ مجھے ایسا کوئی رشتہ نہیں جوڑنا جو بنے ہوئے رشتوں کو توڑ دے۔ جو خون کے رشتوں کو خونی رشتوں میں تبدیل کر دے۔ میں شہریا بھائی سے شادی نہیں کروں گی۔ ان کی خاطر ان سے رشتہ جوڑنے کے لیے مشعل نیچھ سے رشتہ توڑنا چاہا۔ اپنی خوشیوں کے لیے میری زندگی کو موت کی وادی میں

دھکیلنا چاہا۔ اب جبکہ میں جانتی ہوں کہ..... مشعل، شہریار بھائی کو چاہتی ہے تو میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ..... شہریار بھائی کی شادی مجھ سے ہو۔ مشعل جب اس حد تک آگے جاسکتی ہے تو..... میری ان سے شادی کے بعد بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔ اور میں ساری زندگی بے سکونی اور بے اعتباری میں خوف کے حصار میں رہ کر نہیں جینا چاہتی۔ کاش..... کاش۔ مشعل نے مجھ سے کہا ہوتا۔ مجھے بتایا ہوتا تو میں خود امی ابو سے بات کرتی، شہریار بھائی کو راضی کر لیتی مگر..... اس نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ اور جب بتایا تو مجھے کچھ کہنے کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ میں منالیتی ان سب کو لیکن..... اس نے مجھے بہت بلندی سے گرا دیا اور خود بھی بہت پستی میں جاگری ہے۔ کاش! میں شہریار بھائی سے متعلق اس کی فیلنگز کو جان سکتی۔“

سجل نے بھیگتے اور لرزرتے دکھ اور حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ آنسو پھر سے بہنے لگے تھے اور وہ ہاتھوں سے صاف کرتی جا رہی تھی۔ فرجاد نے گہرا طویل سانس لیوں سے خارج کیا اور اس زخم خوردہ لڑکی کو دیکھا جو زخم لگانے والی کو مرہم لگانے کی اس کی زندگی میں خوشیاں لانے کی سوچ رکھتی تھی۔ مگر افسوس کہ اس کم ظرف مشعل نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ اور خود کو اس کی نظروں میں بے وقعت کر ڈالا۔

”تم تندرست ہو جاؤ گی تو میں خود تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔“ فرجاد نے نرمی اور سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں مسیحا، میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ وہ لوگ تو مجھے مردہ سمجھ کر رو بھی چکے ہوں گے۔ اور میرے وہاں جانے سے مشعل کی اس حرکت کا پول کھل جائے گا۔ امی، ابو میری گمشدگی یا موت کا کافی صدمہ اٹھا چکے ہوں گے۔ میں نہیں مشعل کی اس حرکت کا بتا کر مزید رسمی اور غمزہ نہیں کرنا چاہتی۔ میرا غم تو وہ منا ہی چکے ہوں گے نا پھر ایک نیا غم میں کیوں ان کے دامن میں ڈالوں۔ اور وہ بہن ہے میری۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے سب کے سامنے شرمسار اور خوار ہونا پڑے۔ اور جب زخم تازہ ہو تو زخم لگانے والے پر رحم نہیں آتا، غصہ آتا ہے۔ میں غصے میں آ کر حالات مزید بگاڑنا نہیں چاہتی۔ فی الحال میں وہاں نہیں جاسکتی۔“ اس نے سنجیدہ اور مدہم لہجے میں کہا۔

”تو کیا ارادے ہیں، آگے کیا کرنا ہے؟“

”ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر آپ نے مجھے کیوں بچایا مسیحا، مر جانے دیا ہوتا۔“

”اس طرح نہیں کہتے سجل، زندگی تو خدا کی نعمت ہے اور میں انسان ہوں۔ ڈاکٹر بھی ہوں۔ انسان میں انسانیت نہ ہو تو اسے انسان کہلوانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مسیحا اگر نام کا ہی ہو، بروقت کسی کے زخموں پر مرہم نہ لگا سکے۔ کسی کی مسیحا کی نہ کر سکے تو پھر کیا فائدہ اس کی تعلیم و تربیت کا۔ اور آپ جانتی ہیں زندگی بچانے والے اور وسیلہ بنانے والے اور وسیلہ بننے والے کا آپ کی زندگی پر بہت حق ہوتا ہے۔ آپ کی زندگی پھر اس کی امانت ہو جاتی ہے۔ اور آپ اس امانت میں خیانت نہیں کر سکتیں۔“ فرجاد

نے سنجیدہ اور گہرے لہجے میں معنی خیز بات کہی۔

”استغفر اللہ۔ میں شاید مایوس ہو گئی تھی۔ آپ درست کہہ رہے ہیں۔ مجھے اس نعمتِ خداوندی کی ناشکری زیب نہیں دیتی۔ مجھے اگر مرنا ہوتا تو میں مر چکی ہوتی اب تک۔ اس حادثے میں میرا زندہ بچ جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ ابھی مجھے بہت جینا ہے۔ ابھی مجھے بہت کچھ دیکھنا اور سیکھنا ہے، ابھی میری زندگی کا سفر تمام نہیں ہوا۔ آپ درست کہہ رہے ہیں سر، مجھے یوں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ میں پھر سے پہلے والی سبیل بن جاؤں گی مسیحا۔ ہے نا مسیحا۔“ سبیل نے نرمی سے کہتے ہوئے ایک عزم کا اظہار کیا تو فرجاد کو اس پر بے اختیار پیار آنے لگا۔

”انشاء اللہ۔ تم بہت باہمت اور بہادر لڑکی ہو۔ مجھے یقین ہے تم زندگی سے بھرپور لڑکی ہو اور اس حادثے کو خود پر اپنی زندگی پر حاوی نہیں ہونے دو گی۔“ فرجاد نے مسکراتے ہوئے یقین اور اپنائیت سے کہا۔

”مسیحا، لفظ بہت بے معنی سے لگنے لگتے ہیں جب ہم کسی کے احسان کا شکریہ ادا کرنا چاہیں۔ آپ نے جس طرح میری تیمارداری اور مسیحائی کی ہے اس کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے لیکن پھر بھی میں آپ کا شکریہ ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ سبیل نے انہیں دیکھتے ہوئے بہت تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

”شکریہ ادا کرنے کی ضرورت تو نہیں تھی سبیل۔ یہ تو میرا فرض تھا۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”آج کل فرض کون ادا کرتا ہے سر، لوگ تو صرف حق کی بات کرتے ہیں۔ لینے کی بات کرتے ہیں۔ دینے کی تمنا یا لٹانے کا ظرف کسی کسی میں ہی ہوتا ہے۔ اس بے حس اور خود غرض معاشرے میں آپ جیسے لوگ کسی نعمت سے کم نہیں ہوتے۔ آپ بہت عظیم ہیں سر، آپ نے جو نیکی میرے ساتھ کی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر و ثمر ضرور عطا کریں گے۔“ اس نے بہت خلوص سے نرمی سے کہا۔

”پھر تو میں اللہ تعالیٰ سے اپنی مرضی کا اجر و ثمر مانگوں گا۔“ وہ خوش ہو کر بولے۔

”ضرور مانگیں اللہ اپنے بندوں کے دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔ وہ اپنے نیک بندوں کی دعا کبھی رد نہیں کرتا۔“ سبیل نے گہرا سانس لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”تم تو بہت بڑی بڑی اور گہری گہری باتیں کرتی ہو۔“

”اتنی گہری چوٹ کھائی ہے سر کہ ایک دم سے میں بڑی ہو گئی ہوں۔ ورنہ بقول میری امی جان کے، ”سبیل کا بچپنا تو اس کے اپنے بچے بھی آکر ختم نہیں کر سکیں گے۔“ سبیل نے خیالوں میں کھو کر کہا تو فرجاد کو ہنسی آ گئی۔

”مائیں اپنے بچوں کو بہتر جانتی ہیں۔“ فرجاد نے ہیٹر کا وائلم کم کرتے ہوئے کہا۔

”سیسا! میں آپ کے موبائل سے اپنے گھر فون کر سکتی ہوں؟“

”کر سکتی ہو، اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ صبح فون کر لینا اس وقت تو رات کا ایک بجنے والا ہے۔“ فرجاد نے اسے دیکھتے ہوئے اپنائیت سے جواب دیا۔

”جی، صبح ہی فون کروں گی۔“

”پھر تو انہیں پتا چل جائے گا کہ تم زندہ ہو۔ اتم کہہ رہی تھیں کہ تم وہاں جانا نہیں چاہتیں، پھر فون کرنے کا مقصد؟“

”میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ وہاں میرا گمشدگی کے بارے میں کیا بات پھیلی ہے۔ میرا گلا خراب ہو رہا ہے۔ آواز تو رو کر بھاری ہو گئی ہے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ میں کون ہوں۔ میں سب کی سہیلی بن کر بات کروں گی پھر سوچوں گی کہ آگے کیا کرنا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

”چلو جیسے تم مناسب سمجھو مگر ابھی تو سو جاؤ نا، رات بہت ہو گئی ہے۔“

”آپ کو نیند آرہی ہے نا۔“ سب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جب سے تم آئی ہو مجھے نیند ٹھیک سے آہی نہیں رہی۔“ انہوں نے ہنس کر معنی خیز بات کہی۔

”کیوں؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”وجہ بھی تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ ابھی اٹھو اور جا کر سو جاؤ اور ٹیبلٹ کھا کر سونا تا کہ طبیعت پھر سے خراب نہ ہو جائے۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”آپ اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رکھیے گا پلیز، مجھے ڈر لگتا ہے۔“ سب نے کھڑے ہو کر کہا۔

”ڈر کو اپنے دل سے نکال دیں نہ تو یہاں مشعل ہے اور نہ ہی میں اپنے نفس کا غلام ہوں کہ.....“

”پلیز میں نے آپ کو تو ایسا کچھ نہیں کہا۔ میں آپ کو غلط سمجھتی تو کیا دروازہ کھلا رکھنے کا کہتی۔“ سب نے ان کی بات کاٹ کر وضاحت کی تو وہ مسرور ہو کر ہنس دیئے۔

”سوری، شاید میں ہی آپ کی بات کو ٹھیک سے سمجھ نہیں سکا۔ آپ ایت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیں۔ انشاء اللہ بہت سکون کی نیند آئے گی آپ کو۔“

”آئی ایم سوری۔ میں نے اتنے دن سے آپ کو تنگ کر رکھا ہے۔“ وہ نادم ہو کر بولی۔

”کوئی بات نہیں جب مجھے موقع ملے گا تو میں بھی آپ کو تنگ رکھ کر حساب برابر کر لوں گا۔“ فرجاد نے مسکراتے ہوئے

شوخی اور معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔ فرجاد کو یوں لگا جیسے اس خاموش، برف پوش وادی میں تروتازہ گلاس کھل

اٹھا ہو۔ کوئی تارہ جھلملایا ہو، کوئی روشنی کی کرن جگمگائی ہو۔ کتنی دلنشین تھی اس کی ہنسی من میں ہلچل سی مچا دینے والی مسحور کر دینے والی۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور فرجاد وہیں کھڑے مسکرائے جارہے تھے۔

صبح وہ دیر سے بیدار ہوئی تھی۔ ناشتہ کرتے کرتے دن کے سوا گیارہ بج گئے تھے۔ فرجاد سے ابھی تک اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اب تک سو رہے ہیں مگر جب شیرخان نے آکر اسے موبائل فون دیا اور بتایا۔

”بی بی صاب۔ یہ فون صاب جاتے وقت دے گیا تھا۔ آپ سو رہا تھا انہوں نے بولا تھا کہ میں آپ کو دے دوں۔“

”کہاں گئے ہیں فرجاد صاحب؟“ اس نے موبائل اس کے ہاتھ سے لے کر پوچھا۔

”ادھر مارکیٹ تک گئے ہیں۔ آج تھوڑا تھوڑا سورج بھی باہر نکلا ہے۔ راستہ بھی صاف ہے اس لیے صاب کچھ خریداری کرنے گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“

”بی بی، ایک بات پوچھوں۔“ شیرخان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”پوچھو کیا بات ہے؟“ سچل نے اس کے ہلکی ہلکی داڑھی والے سانولے چہرے کو دیکھا۔

”بی بی، آپ اپنے گھر نہیں جائیں گی۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کا کوئی گھر تو ہوئے گا نا۔“

”ہاں تھا مگر اگر گھر نہیں ہے۔ میں اپنے گھر ہی فون کرنا چاہ رہی ہوں۔ پتا نہیں وہاں میرے لیے اب کوئی جگہ ہے بھی کہ نہیں۔ ان کے لیے تو میں مر ہی چکی ہوں گی۔“ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”بی بی، ایک بولے، ہمارا صاب آپ کا بہت خیال رکھتا ہے۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے اور بہت خوش ہے آپ کے ادھر آنے سے۔ آپ۔ بی بی۔ آپ ادھر ہی رہ جاؤ ہمارے صاب کے پاس۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”شیرخان! جہاں رہنا قسمت میں لکھا ہوگا مجھے تو وہیں رکنا ہے۔ خواہ وہ جگہ تمہارے صاحب کی ہو یا کسی اور کی۔“ اس نے سنجیدگی سے سے جواب دیا۔

”ٹھیک بولا آپ نے۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”ویسے شیرخان، تم واقعی پٹھان ہونا؟“ وہ اس کی سانولی رنگت کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں جی ہم اصلی پٹھان ہے۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر اکر کر بولا۔

”کس علاقے کے پٹھان ہو؟“

”اوبی بی صاب۔ آپ مذاق بہت کرتا ہے۔ ابھی ہم جاتا ہے اس سوال کا جواب آپ کو بعد میں دے گا۔ ادھر ہماری

بلبل کی طبیعت خراب ہے۔ آپ دعا کرنا ہم خیر خیریت سے اولاد والا ہو جائے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”انشاء اللہ اللہ کرم کرے گا۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتانا۔ جاؤ اپنی بیوی کے پاس۔ اسے اس وقت تمہاری ضرورت ہو گی۔ یہاں کی فکر نہ کرنا، کھانا وغیرہ میں کھالوں گی۔“ سبجل نے سنجیدگی سے نرمی سے کہا۔

”مہربانی بی بی صاب۔ اللہ آپ کو بھی یہ خوشی دکھائے۔“ وہ اپنی دھن میں بولتا چلا گیا۔ سبجل نے اس کے الفاظ پر غور کیا تو اسے ہنسی آگئی۔

اور پھر اس نے کراچی میں اپنے گھر کا نمبر ملایا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت گھر میں عنبرین بھابھی، امی اور کام کرنے والی ماسی ہوتی ہے۔ اس نے دل میں دعا کی کہ کام کرنے والی ماسی فون اٹھائے اور اس کی دعا قبول ہوگئی۔ کام کرنے والی ماسی نذیراں نے فون اٹھایا تھا۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی پہچان گئی۔ ماؤتھ پیڈ پر رومال رکھ کر اس نے پہلے سلام کیا اور جواب ملتے ہی اس نے پوچھا۔

”ماسی۔ یہاں سب کیسے ہیں۔ کنول آنٹی اور اسرار انکل، کیا حال ہے سب کا؟“

”برا حال ہے جی، جوان موت ہوگئی ہے اور ان بے چاروں کو تو سبجل بی بی کی لاش بھی نہیں ملی کہ کفن دفن کرتے۔ اب تو دسواں بھی ہو گیا ہے۔ اللہ سبجل بی بی کو جنت نصیب کرے۔ بہت نیک لڑکی تھی۔ بی بی، آپ کون بول رہی ہو؟“ اس نے ساری بات دلگیر لہجے میں بتانے کے بعد اس کا نام پوچھا۔

”میں سبجل کی سہیلی بول رہی ہوں۔ کیا سبجل سچ مچ میں مرگئی ہے ماسی؟“

”ہاں جی۔ مشعل بی بی کے سامنے پہاڑی سے گر کے مری ہے۔ بے چاری فلم بنا رہی تھیں۔ پیر پھسل گیا اور وہ موت کے منہ میں چلی گئی۔ ادھر تو سارا خاندان جوان موت پہ پرستہ دینے، افسوس کرنے آرہا ہے۔ سبجل بی بی کے امی ابو کی حالت بہت خراب ہے۔ اور عنبرین بی بی اور شہریار صاحب بھی غم سے چپ ہو کے رہ گئے ہیں۔ یہ بھابھی جی آرہی ہیں۔ آپ ان سے بات کر لو۔“ ماسی نذیراں نے بتایا تو سبجل نے فوراً موبائل آف کر دیا۔ اور بے بسی سے اپنی زندہ موت پر رو پڑی۔ فرجاد نے کچھ دیر بعد گھر آئے تو اس کے آنسو دیکھ کر پہلے تو ٹھٹھکے پھر اس کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر سمجھ گئے کہ وہ اپنے گھر بات کر چکی ہے۔ انہوں نے شاپنگ بیگز میز پر رکھ دیئے۔

”بات کر لی اپنے گھر؟“ فرجاد نے اس کے سامنے میز کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”کر لی۔“

”پھر کیا معلوم ہوا؟“ اس کے آنسو انہیں سب کچھ بتا رہے تھے مگر وہ اس کی زبانی سننا چاہتے تھے۔

”یہی کہ میں..... مر چکی ہوں۔ لوگ میرے گھر والوں سے میری جوانی اور ناگہانی موت پر تعزیت کے لیے آرہے ہیں۔“



امی ابو، بھابھی اور شہریار بھابھی سب سے زیادہ صدمے میں ہیں۔“ اس نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے پُر نرم لہجے میں بتایا۔  
”تمہیں یہ سب باتیں کس نے بتائیں؟“ فرجاد نے دکھی ہو کر پوچھا۔

”کام کرنے والی ماسی نے فون ریسیو کیا تھا اسی نے بتایا ہے۔“

”ویری سیڈ۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ پھر اب کیا پروگرام ہے، جانا ہے گھر؟“

”نہیں۔ اب جب وہ سب میری موت کا صدمہ اٹھا چکے ہیں تو اب جانے سے کیا فائدہ۔ اور میرے نہ ہونے سے میری بہن کو تو فائدہ پہنچ سکتا ہے نا۔ اس طرح اس کی محبت تو مل ہی جائے گی نا جس کو پانے کے لیے اس نے میری زندگی ختم کرنا چاہی تھی۔“ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”بہت بڑا دل ہے تمہارا۔ اپنی بہن کی اس گھٹیا حرکت کو چھپانے کے لیے تم خود اپنے گھر والوں سے چھپ کر رہو گی۔“ فرجاد نے عقیدت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ جب تک مشعل اور شہریار بھائی کی شادی نہیں ہو جاتی تب تک تو میں ان سے دور ہی رہو گی۔ بعد کا کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

”اور اب کہاں جاؤ گی؟“ وہ اس کی صورت کو دیکھ رہے تھے۔

”جہاں تقدیر لے جائے گی۔“ اس نے موبائل صوفے پر رکھتے ہوئے کہا۔

”میرے ساتھ چلو گی؟“

”کہاں؟“

”جہاں میں رہتا ہوں، میرے گھر۔“ وہ اس کی حیرت زدہ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”اپنے گھر کس ناٹے سے لے جائیں گے آپ مجھے؟“

”جو تم پسند کرو۔“

”میں پسند کروں؟“ وہ حیرت اور معصومیت سے ان کی صورت تکتے ہوئے بولی۔

”چلو گی نا میرے ساتھ میرے گھر۔“ ان کے لہجے میں یقین اور مان تھا۔

”آپ اپنے گھر والوں کو، اپنے رشتے داروں کو، ملنے والوں کو میرے بارے میں کیا بتائیں گے کہ..... میں کون ہوں

آپ کی؟“

”یہی بتاؤں گا کہ تم میری بیوی ہو۔“

”جھوٹ بولیں گے سب سے۔“ اس کی معصومیت پر انہیں ٹوٹ کر پیار آنے لگا۔



”نہیں، میں تمہیں اپنی بیوی بنا کر یہاں سے اپنے ساتھ اپنے گھر لے کر جاؤں گا۔ بولو قبول کرو گی مجھے؟“ وہ مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ اس کے تن من میں مسرت اور شادمانی کی کونپلیں پھوٹ پڑیں۔ اتنا حسین و جمیل اور انسان دوست شخص اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ سچل کے لیے یہ بات کسی انمول انعام سے کم نہیں تھی مگر اس کے ذہن میں بہت سے سوال سر اٹھ رہے تھے۔

”آپ کے گھر والے قبول کر لیں گے مجھے؟“ سچل نے پہلا سوال پوچھا۔

”جب میں تمہیں قبول کر لوں گا تو وہ بھی یقیناً تمہیں قبول کر لیں گے۔“

”اور اگر نہ کیا تو؟“ دوسرا خدشہ زبان پر آیا۔

”تم ایسا کیوں فرض کر رہی ہو؟“

”میں زبردستی کی اور ناپسندیدہ ہستی بن کر آپ کے گھر نہیں رہ سکوں گی۔ آپ کے گھر والوں کی مرضی کے خلاف میں وہاں نہیں جاسکتی۔“

”سچل! میرے ساتھ تم وہاں ہستی مسکراتی زندگی بسر کرو گی۔ اور انشاء اللہ اس گھر کی پسندیدہ ہستی بن کر رہو گی۔“ انہوں نے اسے نرمی سے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”پہلے آپ اپنے گھر والوں سے بات کر لیں۔“

”میری بات کا اعتبار نہیں ہے کیا؟“

”یہ تو دل کو تو اعتبار ہے مگر دماغ کہتا ہے کہ خوش فہمی اچھی نہیں ہوتی۔ اور پھر مجھے جو تجربہ ہوا ہے اس نے مجھے رشتوں کا ایک بھیانک روپ دکھایا ہے۔ میں آپ کے گھر والوں کی مرضی اور اجازت کے بغیر آپ کی زندگی میں شامل ہو کر اپنے لیے شرمندگی، ناپسندیدگی اور آزدگی کا سامان نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی میں یہ چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے آپ کے اپنے گھر والوں سے تعلقات خراب ہو جائیں یا آپ کسی قسم کی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔ وہ لوگ میرے بارے میں آپ سے پوچھیں گے کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آئی ہوں؟ کسی کی بیٹی ہوں؟ یوں آپ سے چوری چھپے بغیر اپنے گھر والوں کے شادی کیوں کی ہے میں نے؟“ سچل نے سنجیدگی سے کہا تو فرجاد اپنا سر پکڑ کر حیرت سے بولے۔

”اومائی گاڈ! تم اتنا زیادہ سوچتی ہو۔“

”اب سوچنے کے سوارہ ہی کیا گیا ہے میرے پاس۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”تمہارے پاس بہت کچھ ہے۔ مت سوچا کرو اتنا۔ تمہارے سر کا زخم ابھی پوری طرح نہیں بھرا۔ سوچو گی تو تکلیف

شروع ہو جائے گی۔“ انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔

”یہ زخم تو بھر ہی جائے گا مسیحا۔ اور یہ تکلیف بھی ختم ہو جائے گی مگر جو زخم میری بہن نے میرے دل پر اپنی بے حسی سے لگایا ہے وہ شاید کبھی نہ بھر سکے۔ اس کی تکلیف میں ساری زندگی محسوس کرتی رہوں گی۔“ سبل نے اذیت ناک لہجے میں کہا۔

”نہیں، میں تمہیں ساری زندگی اس زخم کی تکلیف جھیلنے نہیں دوں گا۔ میرے پاس اس زخم اور تکلیف کا علاج ہے۔“

فرجاد نے معنی بات کہی۔

”وہ کیسے؟“

میں محبت ہوں مجھے آتا ہے نفرت کا علاج  
تم ہر اک شخص کے سینے میں میرا دل رکھ دو

انہوں نے یہ شعر سنایا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”کچھ لوگوں کے سینے میں دل کے لیے جگہ ہی نہیں ہوتی۔“

”اچھا لوگوں کی بات چھوڑو اپنی بات کرو۔ مجھ سے شادی کرو گی؟“

”پہلے آپ اپنے گھر والوں سے تو اجازت لے لیں۔“ سبل نے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں میرے حسب نسب پر مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا؟“

”انسان کا حسب نسب تو اس کے کردار و گفتار سے اطوار سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ آپ بہت اچھے، ہمدرد اور با کردار انسان ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے آپ مل گئے۔ ورنہ آج کل جو کچھ ہمارے معاشرے میں مرد، عورت کے ساتھ کر رہے ہیں، جو ذلت اور رسوائی عورت کو دے رہے ہیں اس کو دیکھ دیکھ کر تو مردوں سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔ لیکن آپ نے مجھے جو عزت اور تحفظ دیا ہے اس نے میرے دل میں آپ کا اعتبار قائم کر دیا ہے۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ پر اعتبار کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن.....“

”کہونا۔ جو کچھ تمہارے دل میں ہے کہہ دو۔ اپنے ہر خوف اور خدشے کا اظہار کر دو۔ میں انشاء اللہ تمہارا ہر خدشہ، ہر خوف دور کروں گا۔“ فرجاد نے بے تابی سے کہا۔

”اخبارات میں کسی خوفناک خبریں چھپتی ہیں۔ لڑکی کو پسند کی شادی پر یا لڑکی محض لڑکے کی پسند اور مرضی ہونے پر، جہیز کم لانے یا نہ لانے پر سسرال والے لڑکی کو بہت ٹارچر کرتے ہیں اور اکثر تو اسے زندہ جلا دیتے ہیں، مار دیتے ہیں۔ ایسا نہیں بھی کرتے تو اس کی زندگی موت سے بھی بدتر بنا دیتے ہیں..... اور مسیحا..... میرے پاس تو تن کے ان تین کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس سوائے اپنے آپ کے۔“ سبل نے سنجیدگی سے کہا تو وہ اس کی حقیقت پسندی اس کے نکتہ نظر اس

کے خوف و خدشات جان کر حیرت میں پڑ گئے۔ اس کے مضبوط اور پاکیزہ کردار کا عکس بھی انہیں اس کی سوچ سے اس کی باتوں سے جھلکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”مجھے سوائے تمہارے اور کچھ چاہیے بھی نہیں۔“ انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُر خلوص پُر محبت لہجے میں کہا۔  
 ”سجل! چیزیں یا روپیہ پیسہ کبھی بھی کسی بھی انسان کا نعم البدل نہیں ہو سکتیں۔ تم تو خود بہت قیمتی، بہت پاکیزہ اور انمول ہو۔ جسے تم مل جاؤ گی اسے بھلا کچھ اور مانگنے کی کیا ضرورت ہو گی۔“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ وہ خوشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔  
 ”کیسے یقین دلاؤں میں تمہیں اپنی سچائی کا۔ تم جتنا انکار اور تکرار کر رہی ہو، میرا اصرار تو اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ دیکھو گھر تم جانا نہیں چاہتیں، اور میرے ساتھ جانے سے بھی ڈر رہی ہو، پھر کہاں جاؤ گی۔ باہر تو اور زیادہ برے لوگ ملیں گے تمہیں۔“  
 ”آپ برے تو نہیں ہیں۔“ اس نے ان کی بات کاٹ کر ایمانداری سے دل سے کہا۔

”اچھا ہوں۔“ انہوں نے خوش ہو کر اس کے چہرے کو دیکھا۔  
 ”بہت اچھے ہیں۔“ بچوں کی سی معصومیت اور مسکراہٹ سے جواب دیا۔  
 ”تو اس اچھے انسان سے تمہاری تھوڑی سی جان پہچان تو ہے نہ۔ کسی اور کی ہونے کی بجائے میری ہو جاؤ نا۔“ انہوں نے روح تک سرشار ہو کر محبت سے کہا۔ سجل کا دل تو پہلے ہی ان کی جانب جا چکا تھا اب ان کی خواہش، ان کا اصرار اسے بے بس کر رہا تھا اور وہ خود بھی اتنے اچھے انسان کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ بھری دنیا میں اکیلی کہاں جاتی؟ کیسے رہتی؟ زندگی کا سامان کیسے کر پاتی؟ یہ خیال بہت قوی تھا۔

”آپ بعد میں کسی کے کہنے میں آ کر مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے؟“  
 ”کبھی نہیں، ہاں اگر تم کہو گی تو میں یہ دنیا بھی چھوڑ دوں گا۔“  
 ”ایسا نہ کہیں پھر میرا کیا ہوگا؟“ اس نے بے اختیار بے قرار ہو کر ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ فرجاد کو زندگی اس لمحے اتنی حسین لگی کہ ان کا دل چاہا کہ اس کا ہاتھ چوم لیں۔ مگر ضبط کر گئے کہ اختیار تو ملنے ہی والا تھا۔ پھر بے صبری کا مظاہرہ کر کے جذبوں کو بے مول اور بے توقیر کیوں کیا جائے۔

”تو پھر بلا لاؤں قاضی؟“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولے۔  
 ”جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے نظریں جھکا کر مدھم آواز میں جواب دیا۔ وہ مسکرا دیئے۔  
 ”اور تمہاری مرضی کیا ہے؟“ وہ محبت پاس نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”وہی جو آپ کی مرضی ہے۔“ شریگیں لہجہ تھا۔

”تھینکس سچل۔ انشاء اللہ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ کوئی دکھ نہیں دوں گا لیکن اگر کبھی انجانے میں ایسا کر جاؤں تو

میری بھول سمجھ کر محبت کے بدلے میں مجھے معاف کر دینا۔“ انہوں نے خوشی سے اس کا ہاتھ آہستہ سہلا کر چھوڑتے ہوئے کہا۔

”آپ اپنے گھرباں نہیں کریں گے کیا؟“ اس نے ان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے گھر میں صرف میری امی ہیں۔ امی کو میں نے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا کیونکہ وہ میرے لیٹ ہونے پر

پریشان ہو رہی تھیں۔ البتہ شادی والی بات میں ان سے ابھی کیے لیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے کو منع

نہیں کریں گی۔“ فرجاد نے کھڑے ہو کر موبائل اٹھا کر بتایا۔

”آپ پلیز انہیں یہ مت بتائیے گا کہ مجھے میری بہن نے اس مقام تک پہنچایا ہے۔“ سچل نے ملتی لہجے میں کہا تو وہ اسے

دیکھنے لگے۔

”ارے اچھی لڑکی! تم نے تو میرے فرار کے سارے راستے بند کر دیئے ہیں۔ اب تو سچ مچ قاضی کو بلائے بنا کوئی چارا

نہیں ہے۔“ فرجاد نے اس کی اعلیٰ ظرفی اور معاملہ فہمی کو سراہتے ہوئے اپنے بے کل جذبوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو وہ شرمناک

کمرے سے باہر جانے لگی تو انہوں نے ہنستے ہوئے اسے پکارا۔

”اے اے رکو تو، یہ شاپنگ میں نے تمہارے لیے کی ہے یہ لیتی جاؤ۔“

”کیا ہے اس میں؟“ وہ ناچار واپس پلٹی۔ دل کی دھڑکنیں اپنا انداز بدلنے پر حیران تھیں۔

”اپنی سمجھ کے مطابق تین چار ڈریسز خریدے ہیں تمہارے لیے۔ یہاں تو جیسے ایوے لیبل (میسر) تھے خرید لایا ہوں۔

تمہارے شایانِ شان تو نہیں ہیں لیکن مجبوری ہے فی الحال انہیں پر گزارہ کرو۔ یہاں سے جائیں گے تو خوب شاپنگ کریں گے۔“

”تھینک یو مگر یہ آپ کی ذمہ داری تو نہیں تھی۔“ اس نے شاپنگ بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ لہجے میں احسان مندی

نمایاں تھی۔

”یہ اب میری ہی ذمہ داری ہے۔“ انہوں نے معنی خیز بات کہی تو وہ شرمیلے پن سے مسکرا دی۔

”تھینکس۔ اگر آپ مجھے جگادیتے تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتی، مجھے بھی چند چیزیں خریدنی تھیں۔“ اس نے بیگ

کھولتے ہوئے کہا۔

”تو اب بتا دو میں ابھی جا کر خرید لاتا ہوں۔“

”نہیں، وہ میں خود خرید لوں گی۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا تو وہ جانے کیوں مسکرا دیئے۔

”اچھا ٹھیک ہے کل اکٹھے چلیں گے۔“ فرجاد نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنی والدہ رفعت آراء کو فون کرنے کے لیے موبائل پر ان کا نمبر ملانے لگے۔ سب کے سامنے ہی انہوں نے بات کی تھی بلکہ ان کی اجازت انہوں نے موبائل کا اسپیکر آن کر کے سب کو رفعت آراء کی ”ہاں“ سنا بھی دی تھی۔ سب کو اطمینان ہو گیا۔

جمعہ کا دن تھا۔ فرجاد نے شام کو نکاح کا بندوبست کر لیا۔ وہ یہاں گزشتہ چار سال سے آرہے تھے۔ یہاں کے مستقل رہائشی لوگ انہیں جانتے تھے۔ مسجد کے امام صاحب سے ان کی اچھی دعا سلام تھی۔ سو زیادہ دیر نہیں لگی انتظام میں۔ ادھر شیرخان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ وہ مٹھائی لے کر آیا تو فرجاد اور سب نے اسے مبارک باد دی۔

”شیرخان! اللہ میاں نے جو میرے لیے جنت سے حور بھیجی ہے نا، میں اس سے نکاح کر رہا ہوں۔“ فرجاد نے اسے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”سچ بول رہا ہے صاب۔“ وہ خوشی سے چہکا۔

”بالکل سچ بول رہا ہے۔ اب تم ذرا چائے پانی کا اچھا سا انتظام کر لینا اور ڈرائنگ روم اور بیڈ روم بھی چمکا دو، سجادو۔“ انہوں نے ہنس کر کہا۔

”آپ فکر ہی نہ کرو صاب۔ ہم ایسا چمکائے گا کہ اس میں آپ کو اپنی دلہن کی شکل نظر آئے گا۔“ شیرخان نے جوش سے کہا تو وہ ہنس پڑے۔

”اچھا یہ لو بیٹے کے لیے کچھ خرید لینا۔“ انہوں نے اپنے والٹ میں سے پانچ ہزار روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

”مہربانی صاب۔ ہم اپنے بیٹے کا نام فرجاد حسین رکھے گا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے صاب۔“ اس نے نوٹ لے کر خوش ہو کر کہا۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ویسے سب بی بی نے ”چیتا“ نام بتایا تو تھا۔“

”صاحب! بی بی تو بہت مذاق والی بات کرتا ہے۔ ہم سے پوچھنے لگا کہ تم کدھر کے پٹھان ہو۔ واقعی پٹھان ہو کہ نہیں۔“ شیرخان نے مسکرا کر بتایا تو فرجاد اس کی سانولی رنگت دیکھ کر سب کے اس سوال کو سمجھتے ہوئے بے ساختہ ہنس پڑے۔ شیرخان شرماسا گیا تھا۔

”واقعی شیرخان، تم کدھر کے پٹھان ہو؟“ فرجاد نے مسکراتے ہوئے شریر لہجے میں پوچھا۔

”اوصاب، آپ بھی۔ ہم جاتا ہے آپ کی شادی کی خبر سب کو سناتا ہے۔“ وہ ہنستا ہوا بولا اور واپس چلا گیا۔ فرجاد بھی مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ شام کے لیے کچھ تیاری بھی کرنی تھی۔

شام کو مغرب کی نماز کے بعد کالج میں فرجاد اور سہل کا نکاح پڑھایا گیا۔ مہمانوں کی تواضع مٹھائی، گاجر کے حولے اور چائے سے کی گئی۔ سہل نے فرجاد کے لائے ہوئے ملبوسات میں سے ہلکے گلابی رنگ کا بلوچی کڑھائی والا سوٹ نہا کر زیب تن کیا۔ انہی کی لائی چیزوں میں ہلکی گلابی لپ اسٹک تھی۔ وہ ہونٹوں پر لگائی، آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لکیر بچھائی۔ شیمپو سے دھلے بالوں کو فرنٹ سے بیک کو مب کر کے ہیر پنین لگائیں اور بال کھلے چھوڑ دیئے۔ خوشبو اس کے ٹریول بیگ میں موجود تھی۔ ”فالورا“ کی بھینی بھینی مہک اس کے ملبوس میں رچ بس گئی تھی۔ بس یہی اس نئی نویلی دہن کی تیاری تھی۔

وہ قبول و ایجاب کی رسم کی ادائیگی کے بعد ایک دم سے بہت پرسکون اور ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ اور اس موقع پر اسے امی، ابو، عمار بھائی، بھابھی، موہد، تایا ابو اور ان کی فیملی بری طرح یاد آ رہے تھے۔ اور وہ دشمن جاں مشعل بھی اس کی نظروں کے سامنے اپنی بے حسی کا مظاہرہ کرتی چلی آئی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر اس کے خیال سے پیچھا چھڑایا۔ گھر میں اس کی شادی کی تیار یاد ہو رہی تھیں اور وہ بے خبر تھی۔ اور اب اس کی یہاں شادی ہو گئی تھی تو وہ سب وہاں اس بات سے بے خبر تھے۔ جہاں اس کی روح ”فرجاد حسین“ جیسے شاندار اور باوقار شخص کو پا کر سرشار و شاداب تھی وہاں اس کا دل اپنے میکے سے دوری اور جدائی پر ماتم کناں بھی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں جانے کا راستہ بہت عرصے تک بند ہو چکا ہے۔ وہ سب لوگ اسے مردہ سمجھ کر رو چکے ہیں۔ اور وہ یہاں زندہ سلامت اپنی نئی زندگی کا آغاز کر رہی تھی۔ خوشی اور غمی کے ملے جلے احساسات سے اس کی آنکھوں میں اشک اُمڈ آئے۔

”سہل! ماضی کو بھول کر ہی تم حال کو خوشگوار اور مستقبل کو پُر بہار بنا سکتی ہو۔ پونچھ لو اپنے آنسو اور آنے والی خوشیوں کا کھلے دل سے مسکراتے ہوئے استقبال کرو۔“ سہل کے اندر سے آواز آئی تو اس نے بھی آنسو پونچھنے میں دیر نہیں لگائی۔ فرجاد جانے کب سے اس کے کمرے کے دروازے میں کھڑے اسے اشک بہاتے اور انہیں چھپاتے دیکھ رہے تھے۔ اچانک سہل کی نگاہ دروازے کی جانب اٹھی تو انہیں دیکھ کر اس کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔ فرجاد سفید رنگ کے شلوار قمیض اور پشاوری چپل میں بہت وجیہ اور نکھرے نکھرے لگ رہے تھے۔ اس کے دیکھنے پر وہ مسکراتے ہوئے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے بیڈ کے قریب چلے آئے۔ ہونٹوں پر خوشی سے بھرپور مسکراہٹ سجی تھی۔

”السلام علیکم مسز سہل فرجاد حسین۔“ انہوں نے اپنے دلکش لہجے میں کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ اس نے شرما کر نظریں جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔

”آئیے۔“ انہوں نے اپنا دست جمیل اس کے سامنے پھیلا دیا۔

”کہاں؟“ اس نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

”وہاں جہاں کل شب میں اکیلا تھا مگر آج آپ کا ساتھ میرے ساتھ ہوگا۔“ انہوں نے اپنے کمرے کی جانب اشارہ

کرتے ہوئے جواب دیا تو اس نے حیا آلود مسکان لبوں پر سجائے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ فرجاد نے بہت مسرت سے اس کا ہاتھ دبایا۔ سبجل کا روم روم ان کے لمس کی حدت سے دھک اٹھا۔ وہ بیڈ سے اتر گئی۔ فرجاد اسے رخصت کرا کر اپنے کمرے میں لے آئے۔ بستر پر پھولوں کی پیتیاں چاروں جانب کناروں پر سچی تھیں۔ فرجاد نے اسے بیڈ پر بٹھانے کے بعد سائینڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کجرے اور سفید رنگ کا لفافہ اٹھایا اور اس کے پاس بیٹھ گئے۔ سبجل دل کی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔ فرجاد نے اس کے گلاب چہرے کو بہت حیرت اور محبت سے دیکھا۔ کتنی پُر نور اور اجلی اجلی دکھائی دے رہی تھی وہ۔

”شیر خان نے ٹھیک کہا تھا کہ اللہ میاں نے میرے لیے جنت سے حور بھیجی ہے۔ تم تو سچ مچ حور ہو سبجل۔“ فرجاد نے اسے پیار بھری اور وارفتہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے حور دیکھی ہے کبھی؟“ وہ خوشی اور حیا سے مسکراتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

”دیکھ تو رہا ہوں۔“ ان کی نگاہیں سراپا پیار بنی ہوئی اس کے چہرے پر نقش تھیں۔

”اور خود کا مذکر کیا ہوتا ہے؟“ سبجل نے ہنس کر پوچھا تو فرجاد بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ اور سبجل کا دل پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کو مچلنے لگا۔ ان کی ہنسی سے تو وہ دل کی پلچل پر حیران ہوئی تھی۔ ان کا قہقہہ اسے اور بھی دیوانہ بنا گیا۔

”اف کیا غضب کی ہنسی ہے۔ کیسا دل موہ لینے والا قہقہہ ہے۔“ سبجل نے دل میں کہا۔

”سبجل! یہ ایک چھوٹا سا تحفہ ہے تمہاری رونمائی کا، برا نہ منانا۔ یہاں میں کوئی تحفہ تمہارے لیے پسند نہیں کر سکا اور ڈیور ہا واپس جا کر دوں گا۔ اس میں کچھ کیش رقم ہے اپنی مرضی سے شاپنگ کر لینا۔“ انہوں نے سفید لفافہ اس کے سامنے کر کے کہا۔

لفافے میں ہزار ہزار کے کئی نوٹ تھے۔

”اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ لباس بھی تو آپ ہی لائے تھے۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

”ضرورت ہے میری معصوم شریکِ زندگی۔ لو رکھ لو تا کہ بات ہیلو، ہائے سے آگے بڑھے۔“ فرجاد نے محبت سے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا تو اس نے شرماتے مسکراتے ہوئے لفافہ ان کے ہاتھ سے لے کر سائینڈ پر رکھ دیا۔

”ان کلائیوں میں چوڑیاں تو سچ ہی جائیں گی۔ اور یہ کجرے ان کا تو اصل مقام ہی یہ خوبصورت ہاتھ ہیں۔“ فرجاد نے کجرے اس کی کلائیوں میں پہناتے ہوئے کہا تو اس کے من میں میٹھی میٹھی راگنی چھڑ گئی۔ ان کا لمس، ان کا قرب، ان کی آواز اور لہجہ اس کے حواسوں پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ فرجاد نے اس کے دونوں ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگایا۔ پھر ان کی نرم مٹھاپی اپنی آنکھوں میں جذب کی تو سبجل نے اس خوابناک احساس میں سمو کر آنکھیں موند لیں۔ فرجاد نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بھاری بھر کم لباس اور زیورات کے بغیر کیا دلہن، دلہن لگتی ہے سبجل؟“



”دہن کو تو آپ دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ کو میں دہن لگ رہی ہوں؟“

”ایسی ویسی، ارے تم تو قدرت کا شاہکار ہو۔ چشم بدور۔ تمام لوازمات کے بغیر بھی اپسرا دکھائی دے رہی ہو۔ سولہ سنگھار کر کے تو قیامت ڈھاؤ گی۔“

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ وہ شرما کر بولی۔

”پوچھو جان۔“ محبت لٹاتا لہجہ اس کے اندر سرور اور اطمینان بھر گیا۔

”آپ نے مجھ سے شادی ہمدردی.....“

”نہ، ایسا کچھ مت سمجھنا۔“ انہوں نے نرمی سے اس کی بات کاٹ کر کہا کیونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا کہنا، پوچھنا چاہ رہی ہے۔

”میں اگر تم سے شادی نہ کرتا تو لوگوں کو میری حالت دیکھ کر مجھ سے ہمدردی ہونے لگتی۔ تم نے تو میرا دل ٹھکانے پر نہیں

رہنے دیا۔“

”تو یہ کس کا دل ہے؟“ اس نے ان کے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تو وہ نہال و سرشار ہو گئے۔

”میرا۔“ وہ محبت سے مسکراتے ہوئے بولے۔

”میں لے لوں؟“ کتنی معصوم خواہش اور فرمائش تھی۔

”لے تو چکی ہو۔“ وہ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لیتے ہوئے چمکتے لہجے میں بولے۔

”میں۔“

”ہاں تم اور مجھے تمہاری اس چوری کا بہت دنوں بعد پتا چلا تھا اور یقین آیا تھا۔ بہت خوبصورت چور ہو تم۔ دل کی جگہ

تمہیں دھڑکتا ہوا محسوس کیا تو پتا چلا کہ میرا دل تو تم نے لے لیا ہے اور خود میرے اندر آسمانی ہو۔ اب تو یہاں تم دھڑکتی ہو سبیل۔ تم۔“

فرجاد نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اپنی محبت کا برملا اظہار کیا تو وہ خوشی اور حیار سے دل اور روح تک سیراب و سرشار ہوتے

ہوئے مسکراتے ہوئے نظریں جھکا کر بولی۔

”مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی موتی جیسا جگمگ لمحہ میری روح میں اتر گیا ہو۔ میری زندگی کی اندھیری رات کی

پوروں میں جگنوؤں کے قافلے اتر رہے ہیں۔“

”واہ بھی تم تو جذبوں کا اظہار بہت خوبصورتی سے کرنا جانتی ہو۔“ وہ خوش ہو کر بولے۔

”پتا ہے مسجا۔ جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے لگا جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ آپ مجھے

بالکل.....“



”ٹائم ٹریکس کا ہیر و دکھائی دیے۔ ہے نا۔“ فرجاد نے اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور فرجاد نے بے خود ہو کر پورے استحقاق و اختیار کے ساتھ اسے اپنی آغوش

میں سمولیا۔

اس رات کی صبح کتنی روشن، کتنی اجلی اور خوبصورت تھی۔ سب کو اپنے سر پر تحفظ کی گھنی چادر تھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ

بہت خوش تھی۔ فرجاد کی ایک شب کی محبتوں نے اس کے روم روم میں زندگی بھر دی تھی۔ اس کے لبوں پر مستقل مسکان کو قیام بخش

دیا تھا۔ ان کی پیار بھری سرگوشیاں اب بھی اس کے گالوں پر گلاب بن کر کھل رہی تھیں۔ من میں گدگداہٹ اور ان کے پیار کی

آہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ان سے پہلے جاگ گئی تھی۔ نہا کر تیار ہوئی۔ سبز رنگ کا خوبصورت کڑھائی والا لباس زیب تن کیا۔ بال

سنوارے، خوشبو لگائی اور کانٹے کے کچن میں آ کر اپنے اور فرجاد کے لیے ناشتہ بنانے لگی۔ شیر خان کو اس نے بیٹے کی پیدائش کی خوشی

میں آج کی چھٹی دے دی تھی۔ اس نے پہلے آٹا گوندھا۔ پھر سلنڈر والا چولہا جلا کر چائے کا پانی رکھا۔ تین انڈوں کا آلیٹ بنایا۔

پراٹھے پکائے۔ وہ سب چیزیں ٹرے میں رکھ رہی تھی۔ چائے کا کپ اٹھانے لگی تو فرجاد نے پیچھے سے آ کر اسے ڈاڑیا۔

”ہاؤ۔“ انہوں نے اس کے شانوں پر پیچھے سے آ کر ہاتھ رکھے تو ڈر کے مارے اس کی خوف کے چیخ نکل گئی۔ فرجاد اس

کے ڈرنے پر بے ساختہ ہنسنے لگے۔

”اف، آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ وہ اپنا دل تھام کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”ظرف تو ہے تمہارا ماؤنٹ ایورسٹ جتنا بڑا اور بلند مگر دل کا سائز چڑیا کے دل جتنا ہے۔ ہوں۔“ انہوں نے بہت محبت

سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑی۔ اس کے چہرے پر شرم و حیا کی، خوشی کی دھنک دیکھ کر فرجاد حسین پھر سے ”جی“ اٹھے تھے۔

”یہ شیر خان کہاں ہے بھئی، میری ایک رات کی دلہن اس طرح کچن میں کام کر رہی ہے، ویری بیڈ۔ اگر امی تمہیں یوں

کام کرتے دیکھ لیں ناں تو میری ٹھیک ٹھاک کلاس لے ڈالیں گی۔“ انہوں نے ناشتے کے لوازمات پر نگاہ ڈال کر کہا۔

”بے فکر رہیے، امی یہاں تو نہیں ہیں۔ اور شیر خان آج چھٹی پر ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو انہوں نے سر ہلا

کر کہا۔

”ارے ہاں یاد آیا، آج تو اس کی چھٹی ہے مگر آپ نے کیوں زحمت کی، میں بنا لیتا ناشتہ۔“

”کیوں آپ ایک رات کے دو لہا نہیں ہیں کیا؟“ سب نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ محظوظ ہو کر ہنس پڑے۔ سب کا دل ان

کی ہنسی کے زیر و بم پر دھڑکنے لگا تھا۔

”نازخہ تو دلہن کے اٹھائے جاتے ہیں۔ چلو اب تو تم نے ناشتہ بنا لیا ہے۔ دوپہر کا کھانا ہم کہیں باہر کھائیں گے اور

رات کا کھانا مولوی صاحب کے گھر سے آئے گا۔ انہوں نے رات بہت اصرار کیا تھا سو مجھے ماننا پڑا۔“

”ٹھیک ہے۔ ابھی تو ناشتہ کریں یہ ٹھنڈا ہو جائے گا موسم کی طرح۔“ سچل نے ٹرے اٹھا کر کچن سے باہر نکلتے ہوئے کہا تو وہ اس کے پیچھے ہی نکل آئے۔

”واقعی یار، موسم اس بار کچھ زیادہ ہی ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ لگتا ہے اب کے سورج بھی گھر سے چھتری لے کر نکلا ہے۔“ فرجاد نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی اور ٹرے میز پر رکھ دی۔

”ہوں۔ آملیٹ تو مزیدار بنایا ہے تم نے۔“ وہ صوفے پر بیٹھ کر آملیٹ چکھ کر بولے۔

”ہم گھر کب جائیں گے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ایک دو دن میں چلیں گے۔ راستہ صاف ہو گیا ہے۔ مری اور بھور بن کی سیر کرتے ہوئے اسلام آباد چلے جائیں گے۔“ انہوں نے نوالہ توڑتے ہوئے پروگرام بتایا۔

”فرجان۔“ دھیمے پن سے ان کا نام لیا۔

”جی میری جان۔ ذرا پھر سے لیجئے میرا نام۔“ فرجاد نے بہت خوشی اور محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس کے لبوں پر حیا آلود مسکراہٹ سج گئی۔

”فرجاد۔“ اس نے انہیں دیکھتے ہوئے پھر سے پکارا۔

”ہوں۔ اب کہو کیا کہنا چاہ رہی ہو۔“ وہ خوشی سے مسکراتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”آپ کی امی مجھ سے خفا تو نہیں ہوں گی نا۔“

”کم آن سچل۔ جب میں تم سے خوش ہوں تو وہ خفا کیوں ہوں گی بھلا؟“ وہ اس کے گرد اپنا بازو حائل کرتے ہوئے نرمی سے بولے تو انہیں دیکھ کر دھیمے لہجے میں معصومیت سے گویا ہوئی۔

”میں نے بہت سے ڈراموں اور فلموں میں دیکھا ہے۔ جب ہیر و کو ایسے ہی کسی واقعہ میں کوئی لڑکی مل جاتی ہے تو وہ اس سے شادی کر لیتا ہے اور اپنے گھر لے جاتا ہے۔ اس کی ماں پہلے تو اپنی بہو سے خوش ہوتی ہے پھر خفا ہو جاتی ہے۔ اس پر ظلم کرنے لگتی ہے۔ اور بیٹے کو پتا بھی نہیں چلنے دیتی اور.....“

”اور.....؟“ فرجاد نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جو ان کو اپنے سحر میں جکڑتی چلی جا رہی تھی اپنی معصومیت اور خدشات سمیت بھی۔

”اور بیٹے کی نظروں میں اس کی بیوی کو برا بھی بنا دیتی ہے اور بیٹا بھی پھر ماں جیسا ظالم بن جاتا ہے۔ اپنی بیوی کو مارتا ہے۔“

”جانو! یہ سب تو فلموں اور ڈراموں میں دیکھا ہے نا تم نے۔“ انہوں نے پیار سے کہا۔

”حقیقت میں تو اس سے بھی زیادہ برا ہوتا ہے۔“ سبج نے سہمی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا تو انہوں نے پوچھا۔  
 ”میں برا ہوں کیا؟“  
 ”نہیں تو۔“

”پھر اس خوف کو اپنے دل سے نکال دو۔ میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں یا گھریلو عورتوں کی سازشوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور میری امی بہت لونگ، کیئرنگ اور سویٹ ہیں۔“ انہوں نے اس کے چہرے پر پیار کر کے کہا۔  
 ”مائیں تو ہوتی ہیں لونگ، کیئرنگ اور سویٹ ہیں۔“ سبج نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”تو فکر کیوں کرتی ہو میری جان۔ چلو ناشتہ کرو، اس کے بعد ہم سیر کے لیے نکلیں گے۔ تمہیں مارکیٹ سے کچ خریدنا تھا نا تو وہ بھی خرید لینا۔ لو بسم اللہ کرو۔“ انہوں نے محبت سے کہا اور نوالہ بنا کر اس کے منہ میں دے دیا۔ وہ شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے ناشتہ کرنے لگی۔



”حسین! آپ کی مموی بناؤں؟“ اس نے فرجاد حسین کو ”حسین“ کہہ کر مخاطب کیا تو وہ ہنس کر بولے۔

”تمہاری زبان سے تو مجھے تینوں طرزِ مخاطب ہی اچھے لگتے ہیں۔ جو تمہارا دل چاہے وہی نام لیا کرو مگر مموی تو میں تمہارے ساتھ ہی بناؤں گا۔“ انہوں نے اس کے ہینڈی کیپ کیمرے کو اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ وہ اس وقت کانچ سے باہر وادی کی سیر کو نکلے ہوئے تھے۔

”یہ شوق تمہیں کب سے ہے؟“ انہوں نے کیمرہ اسے دیتے ہوئے پوچھا۔

”شوق تو بچپن سے تھا لیکن یہ کیمرہ مجھے شیری بھائی نے میری کچھلی برتھ ڈے پر گفٹ کیا تھا۔ بس جب سے یہ میرے استعمال میں ہے مگر میں ”لین“ جتنی بہادر نہیں ہوں۔ وہ تو درجنوں آدمیوں کو مارشل آرٹ کے داؤ پیچ دکھا کر چرت کر دیتی تھی۔ پتا ہے اس نے اپنی بہن کو پولیس کی گاڑیوں کے ہجوم سے نکلوا کر ان سے بچا لیا تھا مگر وہ بے چاری کمپیوٹر سے اسے انسٹرکشن دیتی دیتی خود دشمنوں کا مقابلہ کرتی ہوئی ماری جاتی ہے۔ اس کی بہن پولیس سے بچ جاتی ہے۔ ”لین“ کی برتھ ڈے ہوتی ہے اس روز وہ کلبے لے کر گھر آتی ہے تو ”لین“ فرش پر خون میں لت پت پڑی ہوتی ہے۔ وہ بہت روتی ہے۔ ان کا بھی ایسا ہی ایک کیمرہ ہوتا ہے جس میں وہ دونوں بہنیں اپنی باتیں، شرارتیں ریکارڈ کرتی رہتی ہیں۔ اور لین کی سسٹر وہ کیمرہ اس کی قبر کے ساتھ دفن کر دیتی ہے۔ بہت تیز بارش ہوتی ہے وہ بہت روتی ہے اور آخر میں پولیس کی آفیسر کے ساتھ مل کر اپنے ماں باپ اور بہن کے قاتلوں کو مار دیتی ہے۔ مگر مسیحا، میری کہانی تو بہت مختلف ہے نا۔ میری دشمن تو میری اپنی بہن ہی نکلی۔ لین مر گئی تھی اور میں زندہ ہوں۔“ اس نے تفصیل سے اپنے شوق کے ساتھ فلم نیکڈ وپن کی کہانی بھی انہیں سنادی۔ انہیں اس کے انداز میں بچپنا ہی بچپنا دکھائی دے رہا تھا۔

”اور تمہیں زندہ رہنا ہے سمجھیں۔ اور فلمیں بہت دیکھتی ہو تم۔ ہے نا؟“

”نہیں تو۔ ہمارے گھر ڈش اور کیبل ہے ہی نہیں۔ ابونے لگانے ہی نہیں دی تھیں کہ بچوں کی تعلیم کا حرج ہوگا اور اخلاق پر برا اثر پڑے گا۔ وہ تو اب عمار بھائی اور شیری بھائی کبھی کوئی اچھی فلم سینما میں آتی ہے تو سی ڈی لا کر ہمیں دکھا دیتے ہیں۔“ ٹائم ٹریکس، توٹی وی پر لگتی تھی۔ تب تو میں اسکول میں پڑھتی تھی۔ اور میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میرے پاس بھی ہیرو جیسی گھڑی ہو جسے پہن کر میں بھی جہاں چاہے غائب ہو کر پہنچ جاؤں۔ اور اسپیڈ، ٹرمینٹر، بے بیڑے آؤٹ، ٹائی ٹینک اور نیکڈ وپن اور.....“ وہ بولتے بولتے ایک دم خجل سی ہو کر چپ ہو گئی۔ فرجاد بہت انہماک سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرا جor ہے تھے۔

”سوری، میں بہت بولتی ہوں نا۔“ اس نے شرمندگی سے کہا۔

”نہیں۔ اپنوں سے تو اپنی باتیں شیئر کرنی چاہئیں نا، اس طرح ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔“ فرجاد نے مسکراتے ہوئے بہت نرم اور اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ بہت اچھے ہیں شیریں بھائی کی طرح۔ وہ بھی میری باتوں سے تنگ نہیں آتے تھے۔ آپ..... آپ کو پتا ہے نا شیریں بھائی صرف میرے بھائی اور دوست ہیں۔ دوسری کوئی بات نہیں ہے میرے دل میں ان کے لیے نہ پہلے تھی۔ جانتے ہیں نا آپ؟“ وہ بات کہہ تو گئی تھی مگر پھر اسے ایک دم سے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اپنے اور شہریار کے تعلق کی وضاحت کرنے لگی۔

”ہاں، میں جانتا ہوں۔ آؤ گھر چلیں۔“ انہوں نے اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ تمام کر کاٹج کے راستے پر ہولے۔

تیسرے دن وہ لوگ وہاں سے مری، بھور بن گئے۔ پھر اسلام آباد پہنچ کر فرجاد نے گھر جانے کی بجائے ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ اور گھر فون کر کے وہاں گاڑی منگوائی۔ گولڈن کلر کی نیو بیلینو۔ کار دیکھ کر سبل حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہونے لگی۔ اتنے مہنگے ہوٹل میں قیام اور اب یہ کار مگر وہ بولی کچھ نہیں۔ فرجاد اسے اپنے ساتھ اپنی مخصوص اور جاننے والوں کی بوتیکس پر لے گئے۔ نازش ان کے دوست عامر کی بیوی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی وہ خوشی سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

”فرجاد بھائی! اس بار تو آپ نے بہت دن لگا دیئے۔ کیا ’ہنی مون‘ منا کر آرہے ہیں؟“

”ہوں، کچھ ایسا ہی سمجھئے۔“ انہوں نے اپنے برابر میں کھڑی سبل کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو ان کی نظریں بھی نروس ہوتی اس خوبصورت لڑکی پر آریں۔

”یہ کون ہیں؟“

”یہ سبل ہیں میری زندگی، میرا مطلب ہے میری بیوی۔“ فرجاد نے بہت فخر سے بتایا۔

”اسلام علیکم۔“ سبل نے نازش کو دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام، ماشاء اللہ اتنی پیاری سی چھوٹی سی کیوٹ سی بھابھی لائے ہیں آپ ہمارے لیے۔ لیکن ہم آپ سے ناراض ہیں۔“ نازش نے سبل کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر دیکھتے ہوئے مسکراتے اور حیران لہجے میں کہا۔

”مجھے اندازہ ہے کہ کیوں ناراض ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”اتنی دوستی ہے آپ کی اور عامر کی اور آپ نے ہمیں اپنی شادی کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ یہ بہت زیادتی ہے فرجاد بھائی۔ عامر سنیں گے تو وہ بھی آپ سے بہت خفا ہوں گے۔“ نازش نے سبل کے ہاتھ تھامے ہوئے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہرگز نہیں، میں کسی کو خفا ہونے کی اجازت نہیں دے رہا۔ یہ شادی نہایت سادگی سے ہوئی ہے۔ اس میں کسی رشتے دار نے شرکت نہیں کی۔ وجہ اور تفصیل میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ اور میرے ویسے میں شرکت کی تیاری کریں آپ۔ ویسے کی دعوت بہت شاندار ہوگی جس میں سب دوست احباب، عزیز رشتے دار شریک ہوں گے۔ لیکن بھابھی جی، اس وقت آپ میری دلہن کا مپ

لیں۔ ان کے لیے بہت خوبصورت سے پندرہ بیس ڈریسز تیار کرائیں۔ اور ابھی چند ڈریسز ان کے ماپ کے انہیں دکھائیں اور ایک شاندار سا جوڑا انہیں پہنا کر یہاں سے رخصت کریں۔“ فرجاد نے اپنے مخصوص نرم، دھیمے مگر بارعب اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
 ”ابھی لیجئے۔ ویسے فرجاد بھائی، آپ تو چھپے رستم نکلے ہیں۔ کہاں تو کسی کو لفٹ نہیں کراتے تھے اور کہاں یوں اچانک یہ شہزادی بیاہ کر لے آئے ہیں۔“ نازش نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خوشدلی سے ہنس دیئے۔

اور پھر نازش نے سبیل کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے اس کے ماپ کے سات بہت اعلیٰ ڈیزائن کے ڈریسز پیک کر دیئے۔ سبیل نے سرخ اور خون رنگ کا چوڑی دار پاجامہ اور پٹواڑ وہیں ڈریسنگ روم میں پہنا۔ اور جب باہر آئی تو فرجاد نے اسے والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”خطرے کا سنگل لگ رہی ہو۔ آج میری خیر نہیں ہے۔“

”فرجاد۔“ وہ سٹپا گئی تو انہیں ہنسی آگئی۔ وہاں سے وہ اسے بیوٹی پارلر لے گئے۔

”فرجاد! تم بہت بے ایمان ہو، چوری چھپے شادی کر لی اور ہمیں خبر تک نہ کی۔“ افشاں نے انہیں دیکھتے ہی دوستانہ انداز میں شکوہ کیا تو وہ جھل سے ہو گئے اور ہنستے ہوئے سر کھجانے لگے۔ افشاں ان کی ہمسائی اور کالج فیلورہ چکی تھی اور دوست بھی تھی اور ان کے قریبی دوست کا شف کی بیوی تھی۔

”کول ڈاؤن بھابھی۔ ولیمہ ڈنکے کی چوٹ پر کروں گا۔ سارے شہر کو مدعو کروں گا۔ تم جلدی سے میری دلہن کو تیار کر دو۔ گھر پر امی ہماری منتظر ہوں گی۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سبیل حیرت اور حیا کے ہنور میں کھڑی تھی۔

جس طرح فرجاد بڑی بڑی شاپنگ اسپاٹس پر اسے لے جا رہے تھے اور وہاں سب لوگ انہیں بہت عزت، احترام اور دوستانہ بے تکلفی سے مل رہے تھے۔ اس لیے سبیل کو یہ اندازہ لگانا مشکل نہ رہا کہ فرجاد ایک امیر خاندان کے ہر دل عزیز فرد ہیں۔ انہوں نے اسے نہ بتایا تھا نہ بتایا تھا نہ یہ احساس دلایا تھا کہ وہ دولت مند فیملی سے تعلق رکھتے ہیں اور اب وہ خود اپنی آنکھوں سے ان کے ٹھاٹ باٹ دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر پریشان اور خوفزدہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ غریب نہیں تھی۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی۔ ان کے گھر میں دولت کی ریل پیل نہیں تھی مگر پیسے کی تنگی بھی نہیں تھی۔ اچھی خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے وہ لوگ۔ انہیں کوئی کمپلیکس نہیں تھا۔ احساسِ کمتری یا احساسِ برتری کا روگ انہوں نے کبھی نہیں پالا تھا۔ لیکن یہاں ”فرجاد حسین“ کی شخصیت کے بعد اب وہ ان کی امارت سے بھی متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ اسے خوشی کی بجائے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں فرجاد کی امی اسے یوں خالی ہاتھ آنے پر طعنہ نہ دیے لگیں۔ یا کبھی خود فرجاد اسے ایسا کوئی طعنہ نہ دے دیں۔ وہ تو فرجاد کے بارہا یقین دلانے کے باوجود اس بارے میں بھی مشکوک ہو گئی تھی کہ فرجاد کی امی رفعت آراء اسے اپنی بہو کی حیثیت سے قبول کر لیں گی۔

”کہاں کھوئی ہو جانو؟“

وہ لوگ اب فرجاد کے گھر جا رہے تھے۔ گاڑی میں وہ گم صم بیٹھی تھی تو فرجاد نے اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

”کہیں نہیں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”یہ کہیں کھونے کے نہیں ایک دو بجے میں سمونے کے دن ہیں۔ گھبراؤ نہیں تمہارا خوف بس چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔ امی تمہارے استقبال کے لیے گھر کو سجائے تمہاری منتظر ہیں۔“ انہوں نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر دھیمی آواز میں کہا تو وہ ان کی نیلی نیلی آنکھوں میں دیکھ کر شرم سے سرخ ہو گئی۔ فرجاد نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ نرمی سے دبا کر چھوڑ دیا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

گھر تک کا راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ سبیل خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی تھی اور فرجاد اس کی حالت دیکھ کر محظوظ ہو کر مسکرا رہے تھے۔ سبیل کو حیرت کا ایک اور جھٹکا اس وقت لگا جب فرجاد نے گاڑی ”فرجاد ولا“ کے گیٹ کے قریب جا کر روکی اور ہان بجایا۔ ”فرجاد ولا“ دو کینال کی بہت خوبصورت ”ولا“ تھی۔ باہر سے ہی اس کا منظر اتنا حسین تھا کہ اندر کی خوبصورتی کا اندازہ لگانا سبیل کے لیے دشوار نہ تھا۔

چوکیدار نے گیٹ کھولتے ہوئے فرجاد کو ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ فرجاد نے بھی ہاتھ کے اشارے سے ہی اسے جواب دیا اور گاڑی گیٹ سے اندر لے گئے۔ اندر کا منظر اور بھی بہار دکھا رہا تھا۔ روش کے دونوں جانب خوبصورت پھولوں، پودوں سے سجے ہوئے بھرے لان تھے۔ سامنے منقش لکڑی کا بڑا سیاہ رنگ کا دروازہ تھا۔ لان میں خوبصورت کرسیاں بچھی تھیں۔ دروازے پر رفعت آراء اپنے ملازموں کے ساتھ پھولوں کے ہار لیے کھڑی تھیں۔ سبیل نے دیکھا جو نہی گاڑی رکی تھی وہ باوقار خاتون جو ہلکے سبز رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھیں چہرے پر خوشی اور مسکراہٹ کے رنگ سجائے ان کی جانب بڑھیں۔ ملازم اور ملازمائیں بھی ان کے ساتھ آگے بڑھے۔

”السلام علیکم امی جان۔“ فرجاد گاڑی سے اتر کر فوراً رفعت آراء کی جانب لپکے اور ان کے گلے لگ گئے۔

”وعلیکم السلام۔ آگیا میرا چاند میرا بیٹا، کیسا ہے فرجاد تو۔ اتنے دن لگا دیئے۔“ رفعت آراء نے ان کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر ان کا ماتھا چوم کر کہا۔

”آپ کو بتایا تو تھا امی۔ آپ کی دلہن اوہ سوری میری دلہن اور آپ کی بہو بھی آپ کے پیار کی منتظر ہے۔ اس سے نہیں ملیں گی۔“ وہ ان کے ہاتھ چوم کر بولے۔



”کیوں نہیں ملوں گی۔ اس سے ملنے کے لیے تو میں بے چین ہوں اتنے دن سے۔ لاؤ میری بہو کو۔“ رفعت آراء نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آئیے۔“ وہ گاڑی کی جانب آئے اور فرنٹ ڈور کھول کر سبجل کی جانب اپنا ہاتھ بڑھا کر مسکراتے ہوئے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ بہت زیادہ نروس ہو رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے ان کا ہاتھ تھام کر گاڑی سے نیچے اتری تو ملازموں نے ان دونوں پر پھولوں کی پیتیاں نچھاور کیں۔ رفعت آراء اسے دیکھتے ہی آگے آگئیں۔

”امی! یہ سبجل ہیں آپ کے بیٹے کی بیوی۔“ فرجاد نے اس کا تعارف کرایا۔  
”السلام علیکم۔“ سبجل نے ڈرتے ڈرتے آہستگی سے انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو، ماشاء اللہ کیسی پیاری شہزادی جیسی دلہن ہے میرے بیٹے کی۔ بیٹی، تمہیں دیکھ کر تو تمہارا انتظار کی ساری تھکن دور ہو گئی ہے۔ اللہ تمہیں شاد آباد رکھے۔ تم میرے بیٹے کی پسند ہو تو آج سے میری بھی پسند ہو۔“ رفعت آراء نے اس کے گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار پہنا کر اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا اور محبت سے اس کا ماتھا چوم لیا۔ سبجل شرمیلے پن سے مسکرا دی۔

”مبارک ہو صاحب۔“ ملازم نے فرجاد کو مبارک باد دی۔  
”خیر مبارک۔“

”مبارک ہو صاحب۔“ باقی مرد اور خاتون ملازموں نے بھی ایک ساتھ کہا۔  
”شکریہ۔ یہ یو ایم تم سب کی مٹھائی کے پیسے ہیں۔“ فرجاد نے اپنے کوٹ کی جیب سے والٹ نکالا اور اس میں سے ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر ایک ایک نوٹ ان پانچوں کو دے دیا۔ وہ سب خوش ہو گئے۔ کریم بابا نے کہا۔  
”شکریہ صاحب۔ اللہ آپ کی اور دلہن بیگم کی جوڑی سلامت رکھے۔“  
”آمین۔“ فرجاد نے مسکراتے ہوئے دل سے کہا۔

”کریم۔ یہ پیسے آج ہی خیرات کر دو اور صدقے کے بکرے بھی ذبح کرا کے یتیم خانے بھجوا دو۔“ رفعت آراء نے پانچ سو اور سو سو کے کئی نوٹ فرجاد اور سبجل کے سر سے وار کر کے کریم بابا کو دیتے ہوئے ہدایت دی۔  
”جو حکم بیگم صاحبہ۔“ کریم بابا نے فوراً رقم لے کر کہا۔

”آؤ بیٹا۔ اندر چلیں۔“ رفعت آراء نے سبجل کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”بشیر! سامان اندر پہنچا دو۔“ فرجاد نے دوسرے ملازم کو حکم دیا اور ان دونوں کے ساتھ اندر چلے آئے۔



ڈرائنگ روم میں بہت اعلیٰ قسم کے قالین بچھے تھے۔ خوبصورت پردے لگے، سینری ڈیکوریشن پیس، وال کلاک، صوفہ سیٹ دو تھے اور دونوں ہی بہت جدید طرز کے تھے۔ ٹیلی فون سیٹ بھی سائینڈ ٹیبل پر جگمگا رہا تھا۔ سبجل تو خود کو کسی عالی شان محل میں کھڑا محسوس کر رہی تھی۔

”جی تو امی، کیسی لگی آپ کو میری دلہن؟“ فرجاد نے سبجل کے پاس صوفے پر بیٹھ کر انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ سبجل کے ساتھ ہی بیٹھی تھیں۔

”بہت پیاری بہت ہی خوبصورت ہے اتنی معصوم صورت ہے۔ ماشاء اللہ، اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے۔ تمہاری دلہن تو بہت منی سی ہے۔“ رفعت آراء نے ایمانداری سے دل سے کہا۔

”یہ تو آپ نے درست فرمایا امی۔ اس کی باتیں بھی آپ کو بچوں جیسی معصوم لگیں گی۔ اور کبھی کبھی تو یہ بہت استادوں اور فلسفیوں والی گفتگو کرتی ہے۔“ وہ بہت خوش ہو کر بتا رہے تھے۔ رفعت آراء کو ان کی محبت ان کی شریکِ حیات پسند آگئی تھی۔ یہ لمحہ ان کے لیے کسی انمول لمحے سے کم نہیں تھا۔

”اچھا بہت خوب۔“ رفعت آراء نے مسکراتے ہوئے سبجل کے چہرے کو دیکھا جو ان دونوں کے بیچ شرماتی، گھبرائی سی بیٹھی تھی۔ اور فرجاد کے دل میں طوفان اٹھا رہی تھی۔

”کیسری، اور کیسری۔ سامان لے آؤ ادھر۔“ رفعت آراء نے کریم بابا کی بیوی کیسری کو آواز دے کر کہا تو وہ اور دوسری ملازمہ بلی کے ہاتھوں میں پھلوں اور مٹھائی کی طشتریاں لے کر حاضر ہو گئیں۔

”امی! یہ سب کس لیے؟“ فرجاد نے چیزوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”دلہن گھر آئی ہے کیا کوئی رسم نہیں کروں گی میں اور ویسے کا سارا انتظام اب تمہیں ہی کرنا ہے اسی اتوار یا جمعہ کو۔ مجھے تو جمعہ کا دن مناسب لگتا ہے۔“

”ٹھیک ہے امی، جیسے آپ مناسب سمجھیں انتظام ہو جائے گا۔“ فرجاد نے کہا۔

”لو یہ اپنی دلہن کو کھلاؤ۔“ رفعت آراء نے مٹھائی کی طشتری ان کے سامنے کر کے کہا۔ سبجل نے پہلے انہیں اور پھر فرجاد کو دیکھا تو وہ ہنس کر بولے۔

”ساری کھلا دوں۔“

”کھلا کر تو دیکھیں۔“ سبجل نے شرمیلی آواز میں کہا تو ان سب کو ہنسی آ گئی۔

”لومنہ کھولو۔“ فرجاد نے لڈواٹھا کر اس کے منہ کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

”بس میرے خلاف مت کھولنا۔“ فرجاد نے آہستگی سے کہا جو صرف اسی نے سنا اور ہنس دی۔ وہ اسے پیار سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”میرے ہاتھ کا تو لڈو بھی چم چم اور گلاب جامن ہے تو بسم اللہ کرو۔“

اور اس نے منہ کھول کر تھوڑا سا لڈو کھالیا۔

”اب تمہاری باری ہے۔ اپنے دولہا کو مٹھائی کھاؤ۔“ رفعت آراء نے ہنستے ہوئے کہا۔

”گلاب جامن کھانا۔“ فرجاد نے کہا۔

”کیوں مجھے کھلایا تھا آپ بھی لڈو ہی کھائیں۔“ سبیل نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا اور وہی لڈو جو انہوں نے اسے

کھلایا تھا پورا ان کے منہ میں ٹھونس دیا اور ان سب کے ساتھ خوشدلی سے ہنس پڑی۔ پھر پھل ایک دوسرے کو کھلائے۔ رفعت آراء نے سبیل کے ہاتھوں میں سونے کی چھ چوڑیاں اور دو نگن پہنائے۔ سبیل اتنی پذیرائی پر خدا کا شکر بجالائی تھی۔

”لو، یہ تم پہنادو۔“ رفعت آراء نے کجرے اٹھا کر فرجاد کی طرف بڑھادیئے۔

”یہ کام سب سے اچھا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے اور سبیل کے دونوں ہاتھوں میں کجرے پہنادیئے۔ سامنے مووی

میکراس سارے منظر کی فلم بنارہا تھا۔ رسموں سے فارغ ہو کر تینوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ رفعت آراء نے ان دونوں کو آرام کی غرض سے کمرے میں جانے کی اجازت دی اور خود بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

سبیل نے فرجاد کے بیڈروم پر نگاہ ڈالی جواب اس کا بھی تھا۔ کشادہ اور خوبصورت جدید فرنیچر اور دیگر لوازمات سے سجا ہوا۔ یہ بیڈروم سبیل کو بے حد پسند آیا۔ وہ تو فرجاد کی ثروت مندی سے خاصی حیران اور متاثر ہو رہی تھی۔ پیسے کے معاملے میں تو اس کی فیملی ان کے سامنے صفر تھی۔

”پسند آیا اپنا گھر اور اپنا یہ نیا بیڈروم۔“ فرجاد نے اس کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جی بہت خوبصورت ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنے دولت مند ہیں۔“ سبیل نے ان کی شان و شوکت کی طرف

اشارہ کیا تھا۔

”معلوم تو مجھے بھی نہیں تھا کہ ایک دن میں اتنا دولت مند ہو جاؤں گا۔“ فرجاد نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں سمو کر اسے محبت سے دیکھتے ہوئے معنی خیز جملہ ادا کیا تو سبیل کو ان کی محبت اور اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ تشکر سے پلکیں بھگیں لگیں۔

”پتا نہیں میں نے ایسی کون سی نیکی کی تھی جس کے بدلے میں ”آپ“ مجھے مل گئے۔“ سبیل نے خوشی سے چور اور تشکر

سے غم لہجے میں کہا تو وہ نہال اور شادمان ہو گئے۔

”جب سے تم ملی ہونا میں بھی تب سے یہی سوچ رہا ہوں کہ میں نے ایسی کون سی نیکی کی تھی جس کے بدلے میں ”تم“ مجھے مل گئیں۔“ فرجاد نے پوری ایمانداری سے کہا تو اشکِ مسرت اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے اور تمام خوف اور خدشے اس کے دل سے۔

فرجاد نے بہت محبت سے اس کے آنسو اپنی نرم انگلیوں میں جذب کیے اور محبت سے اس کے چہرے پر جھکے اور پیار کے پھولوں کا یہ نذرانہ سبیل کے پورے وجود میں خوشبو بن کر پھیل گیا۔

ویسے کا اہتمام ہوٹل پی سی میں کیا گیا تھا جہاں رشتے داروں، دوستوں اور بزنس کمیونٹی کے لوگوں کا ایک جم غفیر موجود تھا۔ فرجاد سفید شلوار اور سیاہ سنہری کڑھائی والی جدید فیشن کی شیروانی میں بے انتہا وجیہہ و جمیل لگ رہے تھے۔ اور سبیل کا میچ رنگ روپ سلور اور مون لائٹ شرارہ سوٹ میں ہیرے کے نازک عروسی زیورات میں بے پناہ دمک رہا تھا۔ فرجاد کی تو نظریں بار بار اس کے چہرے پر سراپے پرانک رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سبیل کو ساری دنیا کی نظروں سے چھپا کر اپنے دامنِ دل میں چھپا لیتے۔ رفعت آراء اتنی حسین بہو کی ساس بننے پر ملنے والوں سے مہمانوں سے مبارک بادیں وصول کر کے خوش ہو رہی تھیں۔ انہوں نے فرجاد اور سبیل کا صدقہ اتار اتار کر انہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ فرجاد کے دوست عامر اور کاشف بھی اپنی فیملی کے ساتھ اس پُر مسرت اور پُر وقار تقریب میں شریک تھے۔ رفعت آراء کے بھائی صادق منیر، بھادج طاہرہ بیگم، ان کی دونوں بیٹیاں رمشا اور نشاء بھی لاہور سے اس تقریب میں شرکت کے لیے آئی تھیں اور وہ چاروں فرجاد کی سبیل سے شادی پر سخت رنجیدہ اور آگ بگولہ ہو رہے تھے۔

صادق منیر اور طاہرہ بیگم کی دلی آرزو تھی کہ فرجاد ان کی بڑی بیٹی رمشا کو بیاہ کر لے جائے مگر ان کی آرزو خاک میں مل گئی تھی۔ اتنا اچھا دولت مند لڑکا ہاتھ سے نکل گیا تھا اور وہ ہاتھ مسلتے رہ گئے تھے۔ گھر پہنچتے ہی طاہرہ بیگم اور صادق منیر نے سبیل کے سامنے ہی رفعت آراء سے شکوہ کر ڈالا۔

”آپا! آپ نے بہت زیادتی کی ہے۔ ایک انجان لڑکی کو بیاہ لائیں۔ آپ نے تو خاندان بھر کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ایک غیر برادری غیر خاندان کی لڑکی کو اتنی آسانی سے بہو تسلیم کر لیا۔ سارے خاندان والوں کی نظریں اس رشتے پر لگی تھیں۔ اور آپا، ہماری بچیوں میں کیا کمی تھی۔ ہم تو اس لیے چپ رہے کہ آپ بڑی ہیں، سمجھ دار ہیں۔ خود بات چھیڑیں گی تو ہم دل کی بات آپ سے کر لیں گے مگر آپ کو تو ہماری بیٹیاں دکھائی ہی نہیں دیں۔“ طاہرہ بیگم نے ناراضگی اور غصے سے کہا۔ باہر سے مہمانوں کو رخصت کر کے اندر آئے فرجاد دروازے پر ہی رک گئے تھے ان کی باتیں سن کر۔ اور سبیل وہیں صوفے پر بیٹھی دکھ اور شرمندگی سے احساس توہین سے دوچار ہو رہی تھی۔

”کیسری! ذہن کو اس کے کمرے میں پہنچا دو۔“ رفعت آراء نے کیسری کو آواز دے کر کہا تو فرجاد نے غصے سے اپنے ہونٹ بھیجنے لگے۔ گویا سبیل کے سامنے یہ ساری باتیں کہی جا رہی تھیں۔ انہیں طاہرہ بیگم پر غصہ آنے لگا۔ کیسری سبیل کو فرجاد کے بیڈ روم میں چھوڑ آئی۔

”آپا! پہلا حق اپنوں کا ہوتا ہے۔ آپ کو بھائی سے اپنا رشتہ مضبوط کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے بہن ہو کر میری بچپنوں کا خیال نہیں کیا۔ میں اوروں سے کیا گلہ، شکوہ کروں۔“ صادق منیر نے بھی ناراض لہجے میں کہا۔

”تم لوگ ناراض مت ہو۔ دیکھو رشتے تو آسمان پر بنتے ہیں۔“

”مگر جوڑے تو زمین پر جاتے ہیں ناں۔“ طاہرہ بیگم ان کی بات کاٹ کر غصے سے بولیں۔

”آپ چاہتیں تو سبیل کو اپنی بہو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتیں۔“

”ایسے ہی انکار کر دیتی۔“ رفعت آراء نے سنجیدہ اور بارعب لہجے میں کہا۔ ”سبیل میرے بیٹے کی پسند ہے اور مجھے اپنے

بیٹے کی پسند پر پورا بھروسہ ہے۔ سبیل بہت اچھی اور نیک سیرت لڑکی ہے۔“

”ہونہہ، اچھی لڑکی، نیک سیرت لڑکی، جس کے نہ ماں باپ کا پتا ہے نہ ہی بھائی، بہن کا۔ اس کے چال چلن کا بھید تو کچھ

دنوں میں ہی کھلے گا آپا۔ اس نے فرجاد سے دولت کے چکر میں شادی کی ہوگی۔ ایسی لڑکیوں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ نے

تو فرجاد کی طرح آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیا۔ فرجاد تو بچہ ہے۔ اسے کیا پتا ان معاملات کا مگر آپ نے بھی حد کر دی۔ ہمیں

بتائے بغیر بیٹے کا نکاح کر دیا۔ ولیمے کا کارڈ بھیج دیا۔“ طاہرہ بیگم نے طنزیہ، تلخ اور غصیلے لہجے میں کہا۔ فرجاد کا ضبط جواب دے رہا تھا۔

ان کی محبت کے بارے میں ایسے کلمات ادا کر رہی تھیں وہ۔ اور وہ بے بس سے کھڑے سن رہے تھے۔ کچھ بول کر بد مزگی پیدا نہیں کرنا

چاہتے تھے۔ اور پھر رفعت آراء کے رشتے دار تھے وہ خود ہی انہیں سنبھال لیتیں۔ اسی لیے بھی وہ زبان پر تالے ڈالے رہے۔

”دراصل سبیل کے گھر والے دبی جا رہے تھے۔ انہیں شادی کی جلدی تھی اور مجھے بھی سبیل پسند آئی تھی۔ اس لیے ہم نے

سادگی سے نکاح کر دیا۔ وہ لوگ چلے گئے تو ولیمے کا اہتمام کر لیا۔“ رفعت آراء نے اصل بات ان سے چھپائی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں

کہ وہ لوگ مزید باتیں بنائیں اور انہیں پریشان کریں۔

”تو ولیمے تک رک نہیں سکتے تھے وہ لوگ۔ بیٹی تھی کہ کوئی بری بلا تھی جو یوں سر سے اتار کر پھینک گئے۔“ طاہرہ بیگم نے

جلے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہماری رمشا کا تو رورور کر برا حال ہو گیا تھا فرجاد کے ولیمے کا کارڈ دیکھ کر۔ ہم نے خوش فہمی میں اسے بھی کہہ دیا تھا کہ

اس کی شادی فرجاد سے ہوگئی۔ وہ بے چاری جانے کیا کیا خواب دیکھ بیٹھی تھی اور آپ نے اس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔ بڑی

مشکل سے ہم اسے یہاں لائے ہیں۔ آخر کو خاندان کا معاملہ ہے۔ کوئی ہمیں نکاح میں شریک کرنے کے قابل بے شک نہ سمجھے مگر

ہمیں تو خاندان کی عزت اور روایت کا پاس بہر حال ہے سو چلے آئے۔“ صادق منیر نے بیوی کی زبان اور لہجے میں بات کہی۔  
رفعت آراء کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ خوشی کے موقع پر انہوں نے بدمزگی پھیلا دی تھی۔ وہ بہت تحمل کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

”صادق اور طاہرہ تمہارا میرا رشتہ خون کا ہے۔ یہ ذرا سی بات پر تو نہیں ٹوٹ سکتا۔ اور زندگی فرجاد نے گزارنی ہے اس کی زندگی کا ساتھی بھی اس کی پسند کا ہی ہونا چاہیے تھا جو اسے مل گیا بجل کی صورت میں تو میں اپنے بیٹے کی خوشی میں خوش ہوں۔ رمشا اور نشاء بھی میری بیٹیاں ہیں میں خود ان کے لیے اچھے سے رشتے ڈھونڈوں گی۔ اور ایک بینکار کا رشتہ آیا تو ہوا ہے رمشا کے لیے۔ تم لوگ اس کے لیے ہاں کیوں نہیں کر دیتے۔ لڑکا اچھا ہے اور خاندان بھی دیکھا بھالا ہے۔“ رفعت آراء نے نرمی اور سنجیدگی سے کہا۔  
”آپا! ہماری بیٹی اب ہم پر اتنی بھاری بھی نہیں ہے کہ ہم کسی ٹٹ پونچے سے بیاہ دیں۔“ طاہرہ بیگم نے سلگ کر کہا۔  
”طاہرہ! لڑکا پندرہ ہزار روپے ماہوار کماتا ہے۔ اس کا اپنا ذاتی گھر ہے۔ ایک بھائی بہن ہیں ان کی بھی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے اپنے گھروں میں الگ رہتے ہیں۔ لڑکا بھی نیک ہے پھر۔“ رفعت آراء نے نرمی سے کہا۔

”بس رہنے دیں آپا۔ ہم اس سے اچھا رشتہ ڈھونڈ سکتے ہیں اپنی رمشا کے لیے۔ اٹھو صادق۔“ طاہرہ بیگم نے ان کی بات کاٹ کر بدتمیزی سے کہا اور کھڑی ہو گئیں۔ صادق منیر بھی ان کے حکم کے غلام تھے فوراً ان کے ساتھ گیسٹ روم کی جانب چل دیئے۔ فرجاد شدید غصے میں اندر آئے اور رفعت آراء کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”امی! یہ سب کیا ہے؟“

”بیٹا! تم پریشان مت ہو، میں سنبھال لوں گی۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں دلہن تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔“ رفعت آراء نے اس کے قریب آتے ہوئے نرمی سے کہا۔  
”مگرا می۔“

”بیٹا! تم اپنی خوشیاں کیوں خراب کرتے ہو ان کی باتوں کے پیچھے۔ جاؤ شاباش انجوائے یوز لائٹ۔“ انہوں نے ان کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا۔

”تھینک یو امی۔“ انہوں نے ان کا ہاتھ چوم کر کہا اور انہیں ”شب بخیر“ کہہ کر اپنے بیڈ روم میں چلے آئے۔ سبیل بیڈ کے وسط میں دلہن بنی سراپا انتظار تھی۔ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر فرجاد طاہرہ بیگم اور صادق منیر کی کڑوی کیسلی باتوں کو لمحے بھر میں بھول گئے۔ اور خوشی سے مسکراتے ہوئے اپنی دلہن کے سامنے آ بیٹھے۔

”میں ہوں چاند اور تو ہے چاندنی ذرا پلکیں تو اٹھا۔“ فرجاد نے اس کے چاندنی بکھیرتے وجود کو اپنی نگاہوں میں سموتے ہوئے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ رویہ کر کے گنگناتے ہوئے دل کی بات کہی تو سبیل نے حجاب سے پُر مسکان لبوں پر سجا کر پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا تو اس کا دل ان کی نیلگوں آنکھوں میں ڈوبنے لگا۔ محبتوں کا یہ سمندر اسے سرتاپا اپنے اندر سمونے کے لیے سراپا شوق تھا۔

”ماموں ممانی کی باتوں کو دل پر مت لینا۔ تمہارے دل پر صرف میری محبت کا ہاتھ ہونا چاہیے۔ آج تو تم نے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھے اس کا ہاتھ تھام کر والہانہ اور عاشقانہ نظروں سے اس پر نثار ہوتے ہوئے محبت پاش لہجے میں بولے۔

”صرف میں نے؟“ سبج نے ان کے وجیہہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خوشدلی سے تہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

”سبج! تمہارے آنے سے پہلے میری راتیں اس کمرے میں کتابیں پڑھتے پڑھتے سو کر گزرتی تھیں لیکن اب میں پڑھا کروں گا، تمہیں پڑھتے اور محسوس کرتے ہوئے میری راتیں چاندنی راتیں بن کر بسر ہوا کریں گی۔ جیسے تم خود اس وقت چاندنی، روشنی اور کرنوں کی کہکشاں بنی ہوئی ہو۔ آئی لو یومائی لائف۔“ فرجاد نے اس کی انگلی میں ڈائمنڈ رنگ پہنا کر مست و بے خود لہجے میں کہا اور اس کے چاندنی بکھیرتے چہرے پر اپنے احمریں ہونٹوں سے پیار کے ستارے سجادیئے۔

